جمعیت اتحاد العلماء پاکستان

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	عورت کی حکمرانی قرآن وسنت کی روشنی میں	۵
۲	پاکستانی جمہوریت کی نوعیت آئین کی روشنی میں	۶
۳	عورت کی حکمرانی قرآن وسنت کی رُو سے جائز نہیں ہے:	۹
۴	الف: آیاتِ قرآنیہ	۹
۵	ب: احادیثِ نبویّہ	۱۵
۶	ج: اللہ تعالیٰ نے منصب رسالت پر کسی بھی عورت کو مقرر نہیں کیا۔	۱۹
۷	د: نماز کی امامت کا فرض مرد ہی ادا کرسکتا ہے	۲۰
۸	ھ: فقہاءِ اسلام کے اقوال	۲۱
۹	و: مصر کے جامعہ ازہر کی کمیٹی اور علماءِ ازہر کا فتویٰ	۲۸
۱۰	ز: سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم کا فتویٰ	۲۹
۱۱	ح: اسلامی ممالک کے دساتیر میں سربراہِ حکومت کے لیے مرد ہونا لازمی ہے۔	۲۹
۱۲	ط: آئینِ پاکستان کی رُو سے بھی عورت وزیرِ اعظم نہیں بن سکتی۔	۳۱
۱۳	شبہات اور اُن کا ازالہ	۳۶
۱۴	الف: مرد وعورت کی مساوات کو سندِ جواز بنانا	۳۷
۱۵	ب: خلافت سے متعلق آیات کے عموم کو سندِ جواز بنانا	۳۹
۱۶	ج: ملکہ بلقیس کی حکومت کو سندِ جواز بنانا	۴۲

۱۷	د: مولانا اشرف علیؒ کے فتوے کو سندِ جواز بنانا	۴۶
۱۸	ہ: مولانا تھانویؒ کے فتوے کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ	۴۷
۱۹	و: حضرت تھانویؒ نے اپنے سابقہ فتوے سے رجوع کر لیا تھا	۵۱
۲۰	ز: غیر مسلم خواتین کی حکمرانی کو سندِ جواز بنانا	۵۳
۲۱	ح: الأئمة من قریش کا مفہوم	۵۶
۲۲	ط: مسلمان شہزادیوں کی حکمرانی کو سندِ جواز بنانا	۵۷
۲۳	ی: محترمہ فاطمہ جناح کی نامزدگی کو سندِ جواز بنانا	۶۰
۲۴	ک: سانحۂ جمل میں حضرت عائشہؓ کی شرکت کو سندِ جواز بنانا	۶۲
۲۵	ل: حضرتِ عائشہؓ اپنے اس اقدام پر پشیمان اور پریشان تھیں	۶۷
۲۶	م: غزوات میں صحابیاتؓ کی شرکت کو سندِ جواز بنانا	۶۹
۲۷	ن: اسمبلیوں کی رکنیت کو سندِ جواز بنانا	۷۰
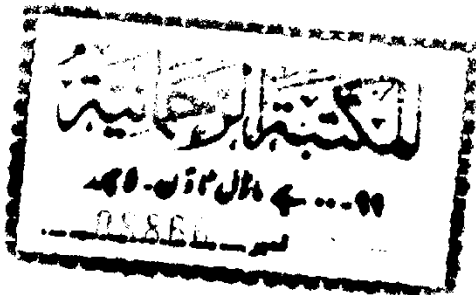
پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اسلام دینِ فطرت ہے اس لیے اس میں معاشرہ کی بنیاد فطرتِ انسانی کی رعایت کرتے ہوئے "الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ" مرد عورتوں پر حاکم ہیں، کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ یہ بات اجماعی ہے بلکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ارشاد کے مطابق تو اس پر پوری انسانیت کا اجماع ہے۔ "خلافت" و "امامت" کی اجماعی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اجتمعت امم بنی آدم علی اشتراطھا" اس کے لازمی ہونے پر تمام بنی آدم کا اجماع ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ) گویا ایک ایسا معاشرہ جو اس شرط کو نظر انداز کر دے وہ نہ صرف یہ کہ اسلامی معاشرہ نہیں رہتا بلکہ وہ فطری انسانی اقدار کی بھی نفی کر دیتا ہے اور اس طرح سے انسانی مقام سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

۱۶ر نومبر ۱۹۸۸ء کو ہونے والے انتخابات میں پاکستان اس حادثے سے دوچار ہو گیا کہ ایک ایسی جماعت کو حکومت بنانے کا موقع ملا جس کی قیادت نسوانی تھی۔ چنانچہ اُس نے مُلک کی باگ ڈور بھی ایک ۳۵ سالہ خاتون کے ہاتھ میں دے دی اور اُسے وزیرِ اعظم بنا دیا۔ لیکن پاکستان جیسے مُلک میں جسے ابھی تک اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، مغربی تہذیب کے اس مظہر کو استقلال نصیب نہیں ہو سکتا چنانچہ اس "حادثہ" کے ظہور کے ساتھ ہی بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ علماء نے اس موضوع پر تحقیقی مقالے لکھنے شروع کر دیے، دانشور قوم کی عقل و دانش سے اپیل کرنے لگے اور سیاستدان عوام کے دلوں پر دستک دینے میں مصروف ہو گئے۔ اور "پُرامن طریقِ کار" کو اختیار کرنے والے عدالتوں کے دروازے پہ پہنچ

گئے ۔ یُوں "عورت کی حکمرانی" کو اپنے قیام کے دن سے مسلسل مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کا اختتام عورت کی حکمرانی کے خاتمہ پر ہی ممکن ہوگا ۔ (انشاءاللہ)

حضرت مولانا گوہر رحمٰن صاحب کا شمار مُلک کے بلند پایہ عُلماء اور ممتاز سیاستدانوں میں ہوتا ہے، چنانچہ اُنہوں نے اس موضوع پر ایک مفصّل مقالہ لکھ کر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے ۔ تاہم پارلیمنٹ کی رُکنیّت کے سلسلے میں حضرت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی رحمۃُ اللہ علیہ کے نقطۂ نظر کی پُوری وضاحت نہیں ہو سکی ۔ اس کی مُختصر وضاحت کے سلسلے میں عرض ہے کہ "عورت کی رُکنیت ایک لحاظ سے جائز قرار پاتی ہے اور ایک لحاظ سے ناجائز ۔ اگر رُکنیت کے منصب اور کام کو دیکھا جائے کہ یہ مشاورت ہے اور عورت اس کی اہلیت رکھتی ہے تو جائز ٹھہرتی ہے اور اگر اختلاطِ مرد و زن وغیرہ کے خطرہ کو ملحوظ رکھا جائے تو ناجائز قرار پاتی ہے ۔" مولانا نے موجودہ معاشرے کے عام حالات اور اختلاطِ مرد و زن کے خطرہ کے پہلو کو ملحوظ رکھ کر اس کی مخالفت کی ہے اور اس کے مقام و منصب کی رعایت کرتے ہُوئے محتاط خواتین کے لیے اسے عملاً گوارا کیا ہے ۔ لیکن اس کی حکمرانی تو کسی پہلو سے جائز نہیں سوائے اس کے کہ اضطراری صُورتحال پیدا ہو جائے اور "اھون البلیتین" کے شرعی ضابطہ کی بنا پر مجبوراً اضطرار کے رفع ہونے تک اسے گوارا کیا جائے ۔

جمعیت اتحّادُ العلماء اس گرانقدر علمی کاوش کو منظرِ عام پر لانے کا شرف حاصل کر رہی ہے ۔ توقّع ہے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی وضاحت ہو جائے گی اور اس سلسلہ میں جو شکوک و شبہات پھیلائے جا رہے ہیں وہ دُور ہو جائیں گے ۔

والسّلام

عبدالمالک

سدر جمعیت اتحّادُ العُلماء پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عورت کی حکمرانی قرآن وسنت کی روشنی میں

مغرب کی سیکولر جمہوریت اور برطانوی طرز کی پارلیمانی حکومت میں سربراہِ حکومت کے استحقاق کے لئے عوام اور عوام کے نمائندوں کی اکثریت کا معتمد ہونا اصل معیار ہے۔ اس نظام میں سربراہ ریاست یا سربراہ حکومت کے لئے نہ مسلمان ہونا شرط ہے اور نہ مرد ہونا ضروری ہے۔ پاکستان میں جو نظام اب تک رہا ہے وہ بھی عملاً غیر اسلامی تھا اور محترمہ بے نظیر کے وزیر اعظم بننے کے بعد اس وقت جو نظام چل رہا ہے۔ یہ بھی غیر اسلامی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام کے لئے زندگی کے تمام شعبوں میں شریعت کی بالفعل بالادستی بنیادی شرط ہے۔ اس غیر شرعی نظام کو شرعی نظام میں بدلنے کے لئے ہر امکانی کوشش کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ لیکن کچھ لوگ محترمہ بے نظیر کی وزارت کے قیام کے لئے شرعی جواز فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور عورت کی حکمرانی کو از روئے شریعت جائز قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ بے نظیر صاحبہ کی حکمرانی ایک امرِ واقعہ اور حقیقت ہے۔ جس کے امرِ واقعہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور مغرب کے پارلیمانی سسٹم کے اصول اور سیکولر ڈیما کریسی کی اقدار کے عین مطابق بھی ہے لیکن اسے اسلام کے اصول کے مطابق قرار دینا شریعت کے احکام اور اسلام کے سیاسی اصول کی تشریح و تعبیر نہیں ہے بلکہ ان میں تحریف ہے اور انحراف ہے۔ علماءِ دین کا بالخصوص اور تمام مسلمانوں کا بالعموم یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ شرعی احکام کے تحفظ کے لئے اور انہیں اپنی اصلی شکل میں محفوظ رکھنے کے لئے تحریف و انحراف کے خلاف آواز اٹھائیں اور مسلمانوں کو دین کا اصل حکم علمی انداز میں سمجھائیں۔ میری اس تحریر کا اصل محرک اور باعث بھی دینی فریضہ ہے۔

پاکستانی جمہوریت کی نوعیت آئین کی روشنی میں

پاکستان یقیناً ایک جمہوری ریاست ہے اور پاکستان کے عوام بھی آمریت پسند نہیں ہیں، بلکہ جمہوریت پسند ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ پاکستانی جمہوریت کی نوعیت کیا ہے؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی جمہوریت کا مفہوم وہی ہے جو مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ہو۔ مسلمانوں کا عقیدہ جو قرآن و سنت کی صریح اور قطعی نصوص پر مبنی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حاکمیت تکوینی اور تشریعی دونوں معنوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے ۔۔۔۔۔ اور طاقت کا سرچشمہ بھی اللہ کی ذات ہے۔ اس لیے پاکستانی جمہوریت قرآن و سنت کی پابند ہوگی۔ آزاد نہیں ہوگی۔

لیکن اس سلسلے میں جب ہم آئینِ پاکستان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس کی دفعات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جمہوریت مغربی اصول پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی اصول اور قرآن و سنت کے احکام و مقتضیات کی پابند جمہوریت ہے۔

درج ذیل آئینی دفعات پاکستانی جمہوریت کے اس مفہوم کا بیّن ثبوت ہیں:۔

دفعہ نمبر ۱ (۱) پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا۔

دفعہ نمبر ۲ ۔ اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا۔

ظاہر ہے کہ مغربی جمہوریت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ مذہب سے آزاد ہوتی ہے۔ ان دونوں دفعات سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی آئینی جمہوریت اسلام کی پابند ہوگی۔ اس سے آزاد نہیں ہوگی۔

دفعہ نمبر ۲ (الف) میں قرارداد مقاصد کے اصول و احکام کو دستور کا مستقل اور موثر حصہ قرار دیا گیا ہے اور قرارداد مقاصد میں کہا گیا ہے کہ:۔

"جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے۔ ملحوظ رکھا جائے گا"

قرار دادِ مقاصد میں

انفرادی اور اجتماعی زندگی کو قرآن و سنت کی متعین کردہ اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق ترتیب دینا بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔

دستور کی اس دفعہ نے ابہام کو بالکل ختم کر کے واضح کر دیا ہے کہ پاکستانی جمہوریت اسلام اور قرآن و سنت کی تشریح کے مطابق ہوگی۔ مغربی جمہوریت کی تشریح کے مطابق نہیں ہوگی۔ یعنی جمہوریت کا مفہوم ابراہیم لنکن جیسے یورپین مفکرین اور سیاست دانوں سے نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مفہوم وہی ہوگا جو اسلام اور قرآن و سنت کی تشریح سے متعین ہوتا ہو۔

دفعہ نمبر ۴۱ (۲) میں صدر کے لئے مسلمان ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

جدول سوم میں صدر اور وزیر اعظم دونوں کے حلف نامے میں

توحید، ختم نبوت اور قرآن و سنت کی جملہ تعلیمات پر ایمان رکھنا اور اسلامی نظریئے کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

دفعہ نمبر ۶۲ (د۔ ہ۔ و) میں پارلیمنٹ کے مسلمان ارکان کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے کہ:

"وہ اسلامی احکام سے انحراف کرنے میں مشہور نہ ہوں، اسلام کے فرائض کے پابند ہوں۔ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے والے ہوں۔ فاسق نہ ہوں اور اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم رکھتے ہوں"

یہ بات ایک کھلی حقیقت ہے کہ مغربی جمہوریت اور برطانیہ کے پارلیمانی نظام میں سربراہِ ریاست اور سربراہِ حکومت دونوں کے لئے نہ مسلمان ہونا ضروری ہے اور نہ ختم نبوت اور قرآن و سنت کی تعلیمات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح ارکانِ پارلیمنٹ کے لئے مغربی جمہوریت میں نہ اسلام کا علم ضروری ہوتا ہے اور نہ اسلام کے احکام پر عمل لازمی ہوتا ہے۔ آئین کی یہ دفعات بھی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں

کہ پاکستانی جمہوریت نے مغربی جمہوریت کا تصور نہیں اپنایا، بلکہ اسلام کے احکام کی پابند جمہوریت کے تصور کو اختیار کیا ہے۔

دستور کے حصہ نہم میں اسلامی احکام سے متعلق دفعات بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ آئینِ پاکستان میں جمہوریت کے مغربی مفہوم کو اختیار نہیں کیا۔ اس لئے کہ مغرب کی جمہوریت کو تو اسلامی احکام سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ ہر قسم کے مذہب کو وہاں پر افراد کا نجی معاملہ سمجھا جاتا ہے جس سے ریاست کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور قوانین کا ماخذ مغرب میں قرآن و سنت یا کسی دوسرے مذہب کی کتابیں نہیں ہوتیں، بلکہ عوام کی منشاء اور ان کی پسند قوانین کا ماخذ اور سرچشمہ ہوتی ہے۔ دستور کی مذکورہ دفعات سے جس نکتے کی وضاحت میرے پیشِ نظر ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری جمہوریت کا قرآن و سنت کی تعلیمات کا پابند ہونا ہمارے ایمان ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے ملک کے آئین کا تقاضا بھی ہے۔ ہمارا آئین بھی ہمارے اس عقیدے کا ترجمان ہے کہ حاکمِ مطلق اللہ کی ذات ہے اور جمہور کو جو اقتدار و اختیار دیا گیا ہے وہ ایک مقدس امانت ہے جسے وہ اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے پابند ہوں گے۔ ہمارے دستور میں بعض دفعات غیر اسلامی بھی ہیں۔ اسی خامی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل نے ترمیمِ دستور کا ایک مسودہ اپنی رپورٹ میں پیش کیا ہے جسے اگر منظور کر لیا جائے تو دستور کی تمام خامیاں بھی دور ہو جائیں گی اور شریعت کی عملاً برتری بھی قائم ہو جائے گی۔

آئین کی دفعہ نمبر ۹۱(۲) میں وزیرِ اعظم کے منصب کے لئے اگرچہ مرد ہونا شرط قرار نہیں دیا گیا، لیکن چونکہ قرارداد مقاصد میں قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ترتیب دینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے وزیرِ اعظم کی تقرری سے متعلق اس دفعہ کو اگر قرارداد مقاصد اور دوسری اسلامی دفعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آئین سازوں کے ذہن میں عورت کو

وزیر اعظم بنانے کا تصور موجود نہیں تھا۔ اس لئے کہ قرآن و سنت اور اسلامی تعلیمات میں عورت کی حکمرانی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے اکتیس (۳۱) علماء نے اسلامی دستور کے لئے جو بائیس ۲۲ نکات بالاتفاق منظور کیئے تھے ان میں سے بارھویں نکتے میں سربراہِ مملکت کے لئے "مسلمان مرد" ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ان نکات میں صدارتی نظام تجویز کیا گیا ہے۔ جس میں سربراہ مملکت خود ہی سربراہ حکومت بھی ہوتا ہے۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ پاکستان میں عملاً قرآن و سنت کے احکام اور آئین پاکستان کی دفعات کے علی الرغم مغربی جمہوریت کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ نہ عوامی نمائندوں کے چناؤ میں اسلامی تعلیمات اور آئینی دفعات کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے تقرر میں اسلامی احکام اور آئینی تصریحات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

عورت کی حکمرانی قرآن وسنّت کی رُو سے جائز نہیں ہے۔

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے جس کی سیاست اسلامی نظریئے کی تابع ہونی چاہیئے۔ اسلامی نظریئے کی بنیاد قرآن و سنت ہے اور قرآن و سنت کی رو سے عورت کی حکمرانی جائز نہیں ہے۔ دلائل درج ذیل ہیں

(الف) آیاتِ قرآنیہ

الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما انفقوا من اموالهم (النساء آیت ۳۴ پارہ ۵)

"مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس وجہ سے کہ زیادہ صلاحیتیں دی ہیں اللہ نے بعض کو بعض پر اور اس وجہ سے کہ خرچ کرتے ہیں وہ اپنے مال"

امام المفسرین ابن جریر طبریؒ نے علی بن ابی طلحہ کی سند کے ساتھ عبداللہ بن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر یہ نقل کی ہے کہ:-

اُمَرَاءُ عَلَيْهَا[1]

یعنی "مرد عورتوں پر حکمران ہیں"

امام فخر الدین رازیؒ ۶۰۶ھ نے لکھا ہے۔

جَعَلَهُ أَمِيرًا عَلَيْهَا[2]

اور امام ابن کثیرؒ ۷۷۴ھ فرماتے ہیں:-

رَئِيسُهَا وَكَبِيرُهَا وَالْحَاكِمُ عَلَيْهَا[3]

یعنی "اللہ نے مرد کو عورت کا امیر، رئیس اور حاکم بنایا ہے"

عربی زبان میں 'قَوَّام' منتظم اور نگران کو کہتے ہیں۔ امیر اور حاکم چونکہ انتظام کا ذمہ دار اور انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے اس لئے یہ لفظ امیر اور حاکم کے معنیٰ بھی رکھتا ہے۔

اس آیت کا تعلق اگرچہ سیاست البیت سے ہے لیکن جب چھوٹی سی ریاست کی سربراہی عورت کو نہیں دی گئی تو سیاست المُدُن یعنی پورے ملک کی ایک ہمہ گیر حکومت کی سربراہی کا منصب اسے کیسے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ مرد کے قوّام ہونے کی وجہ مذکورہ آیت میں یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کو عورت پر فضیلت دی گئی ہے۔ یعنی مرد کی ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی صلاحیتیں عورت سے زیادہ ہیں۔ یہ عورت کی حق تلفی یا اس کی تحقیر نہیں ہے بلکہ یہ تفاوت تقسیم کار کی بنا پر قائم کیا

---

[1] تفسیر ابن جریر طبع مصر ۱۹۵۴ء ج ۵ ص ۵۷ سورۃ النساء آیت ۳۴

[2] تفسیر کبیر ج ۱۰ ص ۸۸

[3] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۷۴

گیا ہے۔ عورت کو اس کے فرائض اور دائرہ کار کے مناسب صلاحیتیں دی گئی ہیں۔
اور مرد کو اس کے فرائض اور دائرہ کار کے مناسب صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اسی فطری تفاوت اور فرائض کے تنوع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم على بعضٍ ط للرجال نصيب مما اكتسبوا و للنساء نصيبٌ مما اكتسبن ط واسئلوا الله من فضله ان الله كان بكل شيئٍ عليماً۔

(النساء آیت ۳۲)

"اور تمنا نہ کرو اس چیز کی جس میں فضیلت دی ہے۔ اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر۔ مردوں کے لئے حصہ ہے ان کے اعمال کا۔ اور عورتوں کے لئے حصہ ہے ان کے اعمال کا۔ اور مانگا کرو اللہ سے اس کا فضل بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد جدید معاشرے کے رجحانات سے پوری طرح آگاہی رکھتے تھے۔ اس آیت کا مفہوم انھوں نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"خدا نے نوع انسانی کو مرد اور عورت کو دو جنسوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی ہستی، اپنے اپنے فرائض اور اپنے اپنے اعمال رکھتی ہیں۔ کارخانہ معیشت کے لئے جس طرح ایک جنس کی ضرورت تھی، ٹھیک اسی طرح دوسری جنس کی بھی ضرورت تھی انسان کی معاشرتی زندگی کے لئے یہ دو مساوی عنصر ہیں جو اس لیے پیدا کئے گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل زندگی پیدا کریں۔ البتہ اللہ نے دنیا میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص خاص باتوں میں مزیت دی ہے۔ اور ایسی ہی مزیت مردوں کو بھی عورتوں

پر ہے۔ مرد عورتوں کی ضروریاتِ معیشت کے قیام کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے سربراہی و کارفرمائی کا مقام قدرتی طور پر انہی کے لیے ہو گیا ہے۔"[1]

(۲) مرد کی قوامیت اور صلاحیتوں میں فوقیت کا ذکر سورۃ البقرہ میں اس طرح ہوا ہے۔

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ واللہ عزیز حکیم ط (البقرہ آیت ۲۲۸)

"اور عورتوں کا بھی حق ہے جس طرح کہ مردوں کا ان پر حق ہے شرعی قاعدے کے مطابق اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔ اور اللہ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔"

اس آیت میں جاہلیت قدیمہ کی تردید بھی کی گئی ہے جس میں عورتوں کی حق تلفی ہوتی تھی اور انہیں صرف استعمال کی ایک چیز سمجھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں کے حقوق بھی ہیں اور فرائض بھی ہیں۔ عورت ہونے کی وجہ سے اس کے اعمال کا اجر کم نہیں ہوگا اور صرف مرد ہونے کی بنا پر اس کے اعمال کے اجر میں اضافہ نہیں ہوگا۔ حقوق و فرائض کا توازن تو شریعت نے قائم کر دیا ہے لیکن "وللرجال علیھن درجۃ" کے فقرے میں تہذیبِ جدید کے اس بے بنیاد اور خلاف فطرت دعوے کی بھی تردید کی گئی ہے۔ کہ مرد اور عورت ہر اعتبار سے ہم درجہ اور مساوی ہیں۔ اسی مزعومہ مساوات کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ فوقیت صرف عدت کے دوران حق رجوع ہی میں نہیں ہے بلکہ ذمہ داریوں کے اعتبار سے بھی ہے کہ مرد کو امارت اور سربراہی کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور عورت کو اس ذمہ داری کے منصب سے سبکدوش کر

---

[1] تفسیر ترجمان القرآن از ابوالکلام آزاد سورۃ النساء آیت ۳۱-۳۲

دیا گیا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے جب طالوت کو بنی اسرائیل کا امیر مقرر فرمایا تو انھوں نے اس کی امارت پر ایک اعتراض تو یہ کیا کہ یہ حکمران خاندان کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا، اور دوسرا یہ کہ اس کے پاس مال و دولت کی فراوانی بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حکومت وقیادت نہ موروثی چیز ہے اور نہ یہ سرمایہ داروں کا حق ہے بلکہ اس کا دارومدار علمی اور جسمانی صلاحیتوں پر ہے۔ طالوت کو اللہ نے علم وجسم میں تم پر فوقیت دی ہے۔

زادہ بسطۃ فی العلم والجسم۔ (البقرہ ۲۴۷)

"اس کو اللہ نے زیادہ فراخی دی ہے علم میں اور جسم میں"

اس آیت میں علمی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں فوقیت وفضیلت کو اہلیت کی شرائط میں شمار کیا گیا ہے۔ صنفِ نازک کی جسمانی کمزوری تو سب کو معلوم ہے اور عقلی طور پر مردوں سے کم ہونا تو خود ارشاد رسول سے ثابت ہے[1]۔

مصر کے ایک شخص قاسم امین بک نے "تحریر المرأۃ" اور "المرأۃ الجدیدۃ" یعنی عورت کی آزادی اور ماڈرن عورت کے نام سے دو کتابیں لکھی تھیں۔ جن میں یورپ کے کچھ فلسفیوں کے اقوال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ عورت اور مرد کی صلاحیتیں ہر اعتبار سے برابر ہیں۔ ان کتابوں کی تردید میں مصر ہی کے ایک دوسرے مفکر علامہ فرید وجدی نے "المرأۃ المؤمنہ" یعنی مسلمان عورت کے نام سے کتاب لکھی ہے جس میں یورپ ہی کے ماہرینِ علوم جدیدہ کی ایک بڑی تعداد کے مستند اقوال نقل کیے ہیں کہ عورت کی عقلی، نفسیاتی اور جسمانی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحیض ص ۴۴ ج ۱ و کتاب الشہادات ص ۳۶۳ ج ۱

صلاحیتوں کا مرد سے کم ہونا سائنٹفک استدلال سے بھی ثابت ہو چکا ہے۔
اس موضوع پر فریدی وجدی نے اپنی دائرۃ المعارف القرن العشرین کی آٹھویں جلد میں تفصیلی بحث کی ہے۔ نیویارک کے جریدے نیوز ویک کے ستمبر ۱۹۸۴ء کے شمارے میں لکھا گیا ہے کہ عورت کی قوتِ کار مردوں سے کم ہے اور اس کی قوتِ کار میں زوال کا عمل بھی مردوں کے مقابلے میں جلدی شروع ہو جاتا ہے۔
جن ملکوں میں عورت نے مرد کے ساتھ ہر کام میں برابری کی کوشش کی ہے وہاں اس نے اپنی نسوانیت کا خون کر کے اپنی اصل صنفی حیثیت تباہ کر دی ہے۔
(۴) ازواجِ رسولؐ جو مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ ان کو بھی اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے کہ:۔ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ۔ (احزاب، آیت ۳۳)
"اور اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھہری رہو۔"
امام جصاصؒ، ابن کثیرؒ، قرطبیؒ، اور دوسرے مفسرینؒ نے اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے کہ یہ حکم تمام مسلمان خواتین کے لئے بھی ہے کہ گھروں میں ٹھہری رہو اور ضرورت کے بغیر گھروں سے نہ نکلو۔ اگر نکلنے کی ضرورت ہو تو پردے کی پابندی کرو۔
يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ۔
ابوداؤد کی یہ حدیث وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کی صحیح تفسیر ہے۔
والمرأة راعية على بيت بعلها وولده وهي مسؤولة عنهم
"عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہداشت کرنے والی ہے۔ اور اس سے ان کے بارے میں بازپرس بھی کی جائے گی۔"
اس آیت اور اس موضوع پر دوسری کئی آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا اصل دائرہ کار گھر ہے اور اس کی حقیقی ذمہ داری گھر کا نظام چلانا ہے مملکت کا نظام چلانا اس کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ وزیر اعظم کا میدانِ کار تو

گھر سے باہر ہونا ہے اور اس منصب کے تقاضے "قرار فی البیت" کے حکم کو توڑے بغیر پورے نہیں کیئے جا سکتے۔ تو آخر وہ کون سی اضطراری صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے خدا کے حکم کو توڑنے کی اجازت دی جا سکے۔ کیا مرد ختم ہو گئے ہیں یا سارے کے سارے ہی نالائق ہیں۔ اس موضوع پر پردے، مخلوط مجالس اور محرم کے بغیر سفر سے متعلق آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ بھی شرعی دلائل ہیں۔ اس لیئے کہ دورِ جدید کی حکمرانی کی ذمہ داریاں ان احکام کو توڑے بغیر پوری نہیں کی جا سکتیں۔ پردے اور مخلوط مجالس اور محرم کے بغیر طویل سفر سے متعلق آیات و احادیث چونکہ معروف ہیں۔ اس لئے انہیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) احادیثِ نبویہؐ

ان چار آیات قرآنیہ سے اگرچہ ثابت ہو چکا ہے کہ حکومت کی سربراہی یا ریاست کی سربراہی عورتوں کے حوالے کرنا شریعت میں ممنوع ہے اور ثبوت شرعی کے لیئے قرآنی آیات کافی و شافی ہیں، لیکن چونکہ احکام شرعیہ کا دوسرا ماخذ سنتِ رسول ہے اور احادیث نبویہ سے مزید ثبوت پیش کرنا اطمینان مزید کا باعث ہے، اس لیئے چند احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) ابو بکرہؓ (نفیع بن حارث) سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ فارس (ایران) والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو حکمران بنا دیا ہے تو اس پر آپؐ نے فرمایا:۔

لن یفلح قومٌ ولّوا امرھم امرأۃ [1]

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی، باب کتاب النبی الی کسریٰ وقیصر، صحیح بخاری کتاب الفتن (بقیہ اگلے صفحہ پر)

"وہ قوم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے عورت کو حکمران بنا دیا ہو۔"
کسریٰ کی یہ بیٹی (پوتی) پوران دخت بنت شیرویہ بن کسریٰ بن پرویز تھی۔ اس کے بعد اس کی بہن ارزمیدخت بھی کچھ مدت تک حکمران رہی تھی۔ یہ ارشاد رسول اللہؐ اگرچہ اہل ایران کے بارے میں ہے لیکن مذمت کی وجہ ان کا اہل ایران ہونا نہیں ہے بلکہ عورت کو حکمران اور والی بنانا اصل وجہ مذمت ہے۔ عورتوں کو حکمران بنانا اور ملک کی باگ ڈوران کے سپرد کرنا ایرانی بادشاہ کسریٰ کے خاندان کی سنت ہے اور موروثی بادشاہتوں کی رسم ہے۔ سنتِ رسولؐ اور سنتِ اصحاب رسول نہیں ہے۔ نہ رسولؐ اللہ نے اپنی بیٹی فاطمہؓ یا بیوی عائشہؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اور نہ صحابہ کرامؓ نے ان میں سے کسی کو سربراہی کے لئے منتخب کیا تھا۔ حالانکہ فاطمہؓ اور عائشہؓ علم و دانش، دیانت و امانت اور عفت و پاک دامنی میں بھٹو صاحب کی بیٹی سے ہزار گنا سے بھی زیادہ فوقیت رکھتی تھیں۔ وہ تو صحیح معنوں میں بے نظیر تھیں افسوس بھی ہے اور حیرت و تعجب بھی ہے کہ پیپلز پارٹی والوں نے سنت رسول اور سنتِ اصحاب رسولؐ کو پس پشت ڈال کر کسریٰ کی سنت کو اور موروثی بادشاہوں کی رسم کو مسلمانوں کے معاشرے میں زندہ کر دیا ہے اور پاکستان کی حکومت کو بھٹو خاندان کی میراث بنا لیا ہے۔

(۲) عن ابی ھریرۃؓ قال رسول اللہ اذا کانت امراءکم خیارکم واغنیاءکم سمحاءکم وامورکم شوریٰ بینکم فظھر الارض خیر لکم من بطنھا واذا کانت امراءکم شرارکم واغنیاءکم بخلاءکم وامورکم الیٰ نساءکم فبطن الارض خیر لکم من ظھرھا ۔

(بقیہ حاشیہ) سنن نسائی، کتاب الفضائل۔ سنن ترمذی، ابواب الفتن ۲۔ سنن ترمذی ابواب الفتن حدیث نمبر ۲۳۶۸ باب نمبر ۷

"جب تمہارے حکمران تم میں سے بہترین لوگ ہوں اور تمہارے دولتمند لوگ سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورہ سے طے کیئے جاتے ہوں تو اس وقت تمہارے لئے زمین کی پیٹھ اس کے پیٹ سے بہتر ہو گی۔ اور جب تمہارے حکمران تم میں سے بدترین لوگ ہوں اور تمہارے دولت مند لوگ بخیل اور کنجوس ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد کر دیے جائیں، تو پھر تمہارے لئے زمین کا پیٹ اس کی پیٹھ سے بہتر ہو گا۔"

خاتون کو وزیر اعظم بنانا مسلمانوں کے ملکی معاملات اس کے سپرد کرتا ہے۔ جس کو رسول اللہ ﷺ نے ذلت قرار دیا ہے۔ منشاء رسول اللہ ﷺ یہ نہیں ہے کہ ایسی صورت حال میں تم خود کشی کر کے مر جاؤ۔ بلکہ اصل منشا اس پیشینگوئی کا یہ ہے کہ ذلت کی اس زندگی کو اطمینان سے نہ گزارو اور خوش دلی کے ساتھ اس فتنے کو برداشت نہ کرو، بلکہ ذلت کی اس صورت حال کو بدلنے کے لئے جدوجہد کرو۔ فتنوں سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمانو! اس فتنے سے اپنے آپ کو بھی بچاؤ اور اپنی قوم کو بھی اس سے بچانے کی فکر کرو۔

(۳) عن ابی بکرۃ رض قال رسول اللہ ﷺ ھلکت الرجال حین اطاعت النساء[۱]

"مرد جب عورتوں کی اطاعت کریں گے تو تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

اس حدیث کا مقصد بھی عورتوں کی حکمرانی کی ممانعت ہے۔ ان کے اچھے مشوروں پر عمل کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ عورتوں کے مشوروں پر تو بعض اوقات خود رسول اللہ ﷺ نے بھی عمل کیا ہے۔

---

[۱] مستدرک حاکم ج ۴ ص ۲۹۱ وقال الذہبی صحیح۔

(۴) عن جابر بن سمرة قال رسول الله لن یفلح قوم یملک رأیهم امرأة [1]

"جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جن کی سوچ پر ایک عورت حکمرانی کر رہی ہو۔"

(۵) عن ابی بکرة رض قال سمعت النبیؐ وذکر بلقیس صاحبة سبأ فقال لا یقدس الله امة قادتهم امرأة [2]

"ابو بکرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے بلقیس جو قوم سبا کی حکمران تھی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اس قوم کو مقدس امت نہیں بناتا جس کی قیادت عورت کے ہاتھ میں ہو۔"

(۶) وہ تمام احادیث نبویہ بھی عورت کی حکمرانی کے ممنوع ہونے کے دلائل ہیں، جن میں عورتوں کو بغیر ضرورت کے گھروں سے باہر گھومنے پھرنے سے منع کیا گیا ہے اور ضرورت کے وقت گھروں سے باہر نکلنے کے لیئے پردے کی شرائط لگائی گئی ہیں اور جن میں محرم کے بغیر سفر کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ محرم کے بغیر حج اور عمرے کا سفر بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے اور جن میں عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجالس اور آزادانہ میل ملاپ سے منع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک کا نظام چلانے کے ساتھ ان شرعی حدود کی پابندی نہیں کی جا سکتی اور "حدود اللہ" کو توڑے بغیر کوئی بھی عورت سربراہ ریاست کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتی۔ یہ احادیث، حدیث کی تمام کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ اور مشہور و معروف ہیں۔ اس لیئے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے مذکورہ حوالوں سے یہ بات کھل کر سامنے آ

---

[1] مجمع الزوائد از حافظ نور الدین ھیثمی ص ۲۰۹ ج ۵ باب ملک النساء۔

[2] مجمع الزوائد ص ۲۱۰ ج ۵ باب ملک النساء۔

جاتی ہے کہ عورت نہ وزیر اعظم بن سکتی ہے نہ اور نہ صدر مملکت بن سکتی ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے زیادہ مضبوط دلیل اور کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ شریعت اور جمہوریت کے درمیان جب تضاد آجائے تو مسلمان جمہوریت پر شریعت ہی کو ترجیح دے گا اور جمہوریت کو اسی حد تک ملحوظ رکھے گا، جس کی شریعت کے اندر گنجائش ہو۔ امت مسلمہ قانونی اور دستوری قوت عوام سے نہیں بلکہ قرآن و سنت سے حاصل کرتی ہے۔

(ج) اللہ تعالیٰ نے منصب رسالت پر کسی بھی عورت کو مقرر نہیں کیا

قیادت و امارت کے اصل مستحقین انبیاء کرام تھے۔ اس لئے کہ ان کی تربیت براہِ راست اللہ تعالیٰ نے کی تھی اور وہ ظاہر و باطن دونوں کے اعتبار سے پاکیزہ ترین انسان تھے اور معصوم تھے۔ انبیاء کے علاوہ وہی انسان قیادت و امارت کا جائز حق دار ہو سکتا ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا پابند ہو اور حکومت و امارت کا سارا نظام ان تعلیمات کے عین مطابق چلاتا ہو۔ زمین پر پہلا خلیفہ اور حکمران آدمؑ کو بنایا گیا تھا جو مرد تھے اور اللہ کے نبی تھے۔ صحیح بخاری میں ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل کی سیاسی رہنمائی (اور دینی قیادت) ان کے انبیاء کرتے تھے۔ جب ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی آجاتا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ بلکہ اب یہ سیاسی راہنمائی میرے خلفاء کریں گے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت کا سربراہ رسول اللہ کے نائب کے طور پر حکومت کا نظم چلاتا ہے۔ ورنہ قیادت و امارت حقیقت میں نبی کا فرض منصبی ہے۔ قرآن کریم کی صریح نص میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر کبھی بھی عورت کو مقرر نہیں کیا۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

وما ارسلنا قبلك الا رجالا نوحی الیهم فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ (الانبیاء ۷)

"اور نہیں بھیجا تھا ہم نے (رسول بنا کر) آپ سے پہلے مگر مردوں کو۔ وحی بھیجی تھی ہم نے ان کی طرف، پس پوچھ لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے"۔

یہ آیت صاف صاف بیان کرتی ہے کہ تمام پیغمبر بلا استثنار مرد مقرر کیے گئے تھے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو ظاہر ہے کہ حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اسلامی حکومت کا سربراہ رسول کا نائب ہوتا ہے اور اس کی حکومت خود مختار نہیں ہوتی، بلکہ نیابتی حکومت ہوتی ہے تو اس نیابتی حکومت کا سربراہ بھی مرد ہی ہو سکتا ہے۔

(د) نماز کی امامت کا فرض مرد ہی ادا کر سکتا ہے

اسلامی حکومت کے سربراہ کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ جس مسجد میں نماز پڑھتا ہو، اس کی امامت بھی وہ خود کرے گا۔ رسول اللہؐ حکومت کے سربراہ بھی تھے اور مسجد نبوی میں نماز کی امامت بھی خود کرتے تھے اور جب سفر پر تشریف لے جاتے تو کسی صحابیؓ کو نماز کی امامت کے لئے اپنا نائب مقرر فرماتے تھے۔ مرض موت میں امامت کی یہ اہم ترین ذمہ داری آپؐ نے ابو بکرؓ کے سپرد کر دی تھی۔ سقیفہ بنو ساعدہ کے انتخابی اجلاس میں ابو بکرؓ کے استحقاق کی ایک دلیل یہ بھی بیان کی گئی تھی کہ رسول اللہؐ نے جب نماز کی امامت کے لئے اسے پسند فرمایا تھا تو ملک کی قیادت و امامت کے مستحق بھی یہی ہو سکتے ہیں۔ اگر بالفرض مردوں میں کوئی بھی حکومت کی سربراہی کا اہل موجود نہ ہو تو ایسی فرضی صورت حال میں تو کہا جا سکتا ہے کہ عورت حکمران ہو اور نماز کی امامت کے لئے کسی مرد کو مقرر کر دے لیکن جب اہلیت کے حامل مرد ہزاروں کی تعداد میں موجود ہوں تو ضرورت کیا ہے کہ نماز کی امامت اور ملک کی امامت کو تقسیم کر دیا جائے؟

یہی وجہ ہے کہ فقہاء اسلام نے لکھا ہے کہ حکومت کا سربراہ مرد ہی ہونا چاہیئے

جو نماز کی امامت کی اہلیت رکھتا ہو۔ امامت کبریٰ (حکمرانی) اور امامت صغریٰ (نماز کی امامت) کی شرائطِ استحقاق یکساں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سیاست کی جدائی کا جو تصور سیکولر ریاستوں میں اپنایا گیا ہے، اسی کو آج کل نام نہاد ترقی پسند اور روشن خیال لیڈروں اور سیاستدانوں نے پاکستان میں اختیار کر لیا ہے ورنہ اسلام میں دینی قیادت کی اہلیت کے لئے جو شرائط ہیں، معمولی سی فرق کے ساتھ وہی سیاسی قیادت کی شرائط بھی ہیں۔ عورت جب نماز کی امامت کی اہل نہیں ہے تو سیاسی قیادت اور حکمرانی کی بھی اہل نہیں ہے۔

(ھ) فقہاءِ اسلام کے اقوال

قرآن و سنت کے مذکورہ دلائل ہی کی بناء پر فقہاءِ اسلام اور علماء علم الکلام نے بھی صراحتًا لکھا ہے کہ امامتِ کبریٰ (حکمرانی) کے استحقاق کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مرد ہو۔ عورت امامت صغریٰ (نماز کی امامت) کی طرح امامتِ کبریٰ (حکمرانی) کی اہل بھی نہیں ہے۔

(۱) ابن الہمام حنفیؒ کی کتاب "المسایرہ" علم الکلام کی کتاب ہے، جس میں اہل سنت والجماعت کے اصول بیان ہوئے ہیں۔ شرائط امام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

الاصل التاسع شرط الامام بعد الاسلام خمسۃ الذکورۃ والورع والعلم والکفاءۃ[1]

"نواں اصل (قاعدہ) یہ ہے کہ حکمران کی اہلیت کے لئے مسلمان ہونے کے علاوہ پانچ شرطیں ہیں۔ مرد ہونا، پرہیز گار ہونا، دین کا علم رکھنا اور انتظامی امور کی کافی صلاحیت رکھنا"

---

[1] المسایرہ رکن رابع۔ اصل تاسع۔

(۲) علم الکلام کی متداول کتاب شرح عقائد میں لکھا ہے۔

ویشترط ان یکون من اھل الولایۃ ایسے مسلمًا حرًا ذکرًا عاقلًا بالغًا ع[1]

"حکمران کے لئے شرط ہے کہ وہ ولایت (حکمرانی) کی اہلیت رکھتا ہو۔ یعنی یہ کہ مسلمان ہو، آزاد ہو، مرد ہو، عاقل ہو اور بالغ ہو"

علامہ تفتازانی ہی کی دوسری کتاب "شرح المقاصد" میں بھی اسی طرح کی عبارت موجود ہے۔

(۳) شرح عقائد کی شرح نبراس میں ہے کہ:۔

قد اجمع الامۃ علی عدم نصبھا حتی فی الامامۃ الصغریٰ ع[2]

"امت نے اجماع کر لیا ہے اس پر کہ عورت کو سربراہ حکومت نہیں بنایا جا سکتا۔ یہاں تک کہ نماز کی امامت میں بھی اسے امام نہیں بنایا جا سکتا"

امام قرطبی متوفی ۶۷۱ھ لکھتے ہیں:۔

واجمعوا علی ان المرأۃ لا یجوز ان تکون اماما ع[3]

"فقہا کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت کا حکمران بنانا جائز نہیں ہے"

(۵) امام ابن کثیرؒ متوفی ۷۷۴ھ فرماتے ہیں:۔

الملک الاعظم مختص بالرجال ع[4]

"حکومت کی سربراہی مردوں کے لئے مخصوص ہے"

---

[1] شرح عقائد بحث امامت

[2] نبراس شرح، شرح العقائد ص۵۲۶

[3] تفسیر قرطبی ج ۱ ص ۲۷۰ و ج ۵ ص ۱۶۸

[4] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۷۴، سورۃ النساء آیت ۳۴

(۶) قاضی ابوبکر ابن العربی متوفی ۵۴۷ھ فرماتے ہیں:۔

نص فی ان المرأة لا تکون خلیفة و لا خلاف فیہ [1]

" یہ حدیث (لن یفلح قوم الخ) صریح دلیل ہے اس بات کی کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی اور اس بارے میں کوئی خلاف نہیں ہے"

(۷) امام ابن حزم ظاہری متوفی ۴۵۶ھ لکھتے ہیں:۔

لا تحل الخلافة الا لرجل [2]

"اسلامی حکومت کی سربراہی حلال نہیں ہے مگر مرد کے لئے"

(۸) ابن نجیم مصری حنفی متوفی ۹۷۰ھ لکھتے ہیں:۔

ذکر الآمدی ان شروط الامامة المتفق علیها ثمانیة الاجتهاد فی الاحکام الشرعیة و ان یکون بصیراً بامر الحروب و تدبیر الجیوش و ان تکون له قوة بحیث لا تهوله اقامة الحدود و ضرب الرقاب و انصاف المظلوم من الظالم و ان یکون عدلاً ورعاً بالغاً ذکراً حراً نافذ الحکم مطاعاً قادراً علی من خرج عن طاعته [3]

"آمدیؒ نے ذکر کیا ہے کہ امامت (حکمرانی) کی متفقہ شرائط اہلیت آٹھ ہیں۔ جو یہ ہیں۔(۱) احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لئے اجتہادی قوت۔ (۲) جنگی امور اور فوجوں کے انتظام کے بارے میں بصیرت و مہارت۔ (۳) مضبوط قوت ارادی جس کی وجہ سے وہ شرعی سزاؤں کے نفاذ، مجرموں

---

[1] تفسیر قرطبی ص ۱۸۳ ج ۱۳

[2] المحلی ص ۳۵۹ ج ۹ کتاب الامامة

[3] الاشباہ و النظائر مع شرح الحموی، طبع ادارہ قرآن کراچی ص ۲۶۶ ج ۲

کی گردنیں کاٹنے اور مظلوم کو ظالم سے اس کا حق دلانے کے وقت ہیبت زدہ نہ ہوتا ہو۔ (۴) عادل اور پرہیزگار ہونا (۵) بالغ ہونا۔ (۶) مرد ہونا۔ (۷) آزاد ہونا۔ (۸) احکام اور فیصلوں کے نفاذ کی قوت جس کی بنا پر لوگ اس کی اطاعت کرتے ہوں اور وہ اپنے احکام کی تعمیل سے انکار کرنے والوں پر قابو پانے کی قدرت رکھتا ہو۔"

ان شرائط میں سے بعض تو استحبابی شرطیں ہیں یعنی ان کا ملحوظ رکھنا بہتر ہے۔ لازمی نہیں ہے۔ لیکن بالغ ہونا، مرد ہونا اور آزاد ہونا اور اپنے احکام اور فیصلوں کی تعمیل کروانے کی قوت رکھنا، وہ چار شرائط ہیں جن کے بغیر حکومت شرعاً قائم ہی نہیں ہو سکتی۔ اور شرعی لحاظ سے اس کے احکام قابل تنفیذ ہی نہیں ہوتے۔

(۹) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ لکھتے ہیں:۔

"و ازاں جملہ آنست کہ ذکر باشد نہ امرأۃ۔ زیرا آنکہ امرأہ ناقص العقل والدین است و در جنگ و پیکار بیکار و قابل حضور محافل و مجالس نے پس از روے کارہائے مطلوب نہ برآید[1]"

" سربراہِ حکومت کی شرائط اہلیت میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرد ہو، عورت نہ ہو۔ اس لئے کہ عورت کی عقلی قوت ناقص ہے۔ جنگ و پیکار میں بے کار ہے اور محفلوں میں شرکت کے قابل نہیں ہے۔ تو اس سے مطلوبہ ذمہ داریاں پوری نہیں ہو سکیں گی۔"

(۱۰) مشہور حنفی فقیہہ علامہ علاؤ الدین حصکفی متوفی ۱۰۸۸ھ درمختار میں لکھتے ہیں۔

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء طبع لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۲

و یشترط کونہ، مسلماً حراً ذکراً عاقلاً بالغاً [1]

"اور حکمران کا مسلمان، آزاد، مرد، عاقل اور بالغ ہونا شرط ہے۔"

ابن العابدین شامی متوفّی ۱۲۵۲ھ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ:۔

"عورتوں کو گھروں میں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس جانب رسول اللہ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے عورت کو اپنا حکمران بنایا ہو" [2]

(۱۱) قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ لکھتے ہیں۔

ولذالک خصوا بالنبوۃ والامامۃ والولایۃ [3]

"اسی وجہ سے (مرد کے قوام ہونے کی وجہ سے) نبوت، امامت اور حکومت مردوں کے لیئے مختص ہے"

(۱۲) قاضی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ لکھتے ہیں:

ان المراۃ لیست من اھل الولایات ولا یحل لقوم تولیتھا

"عورت حکمرانی کے اہل نہیں ہے۔ اور کسی بھی قوم کے لئے اسے حکمران بنانا حلال نہیں ہے (نیل الاوطار) ص ۱۶۸، ج ۹

(۱۳) مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری متوفی ۱۳۵۳ھ لکھتے ہیں۔

قال الخطابیؒ وفی الحدیث ان المرأۃ لا تلی الامارۃ [4]

---

[1] مجموعہ شامی ص ۵۱۲ ج ۱۔ باب الامامۃ

[2] مجموعہ شامی ص ۵۱۲ ج ۱

[3] تفسیر مظہری النساء ۳۴ [4] تحفۃ الاحوذی ص ۵۴۲ ج ۶

"امام خطابیؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث (لن یفلح قوم الخ) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی"۔

(۱۴) مولانا اشرف علی تھانویؒ متوفی ۱۳۶۲ھ لکھتے ہیں:۔

"ہماری شریعت میں عورت کو حکمران بنانے کی ممانعت ہے پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا۔ دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدی میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے حجت نہیں"۔ [1]

(۱۵) مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:۔

"سربراہی وکارفرمائی کا مقام قدرتی طور پر انہی (مردوں) کے لیے ہو گیا ہے"۔ [2]

(۱۶) علامہ سید امیر علی ملیح آبادی متوفی ۱۹۱۹ء لکھتے ہیں:۔

"ولایت وسلطنت بھی مرد ہی کو مخصوص ہے"۔ [3]

(۱۷) مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ لکھتے ہیں:۔

"عورتوں کے ہاتھ میں عہدہ اور منصب دے دینا یہاں تک کہ انہیں پورے ملک کی ملکہ یا فرمانروا بنا دینا یورپ کی ایجاد نہیں ہے۔ مشرک قوموں کے ہاں یہ دستور ہر زمانہ میں رہا ہے۔ یہ تو اسلام تھا جس نے آکر بریک لگایا اور اس دستور کو ناجائز قرار دیا۔ صحیح بخاری کی صاف حدیث ہے (لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ)"۔ [4]

---

[1] تفسیر بیان القرآن النمل ۲۳۔ [2] تفسیر ترجمان القرآن النساء ۳۴۔ [3] مواہب الرحمان ص ۳۱ ج ۵۔
[4] تفسیر ماجدی سورۃ النمل آیۃ ۲۳

(۱۸) مفتی محمد شفیع متوفی ۱۳۹۶ھ لکھتے ہیں :-

"علماء امت اس پر متفق ہیں کہ کسی عورت کو امامت و خلافت یا سلطنت و حکومت سپرد نہیں کی جا سکتی - بلکہ نماز کی امامت کی طرح امامت کبریٰ صرف مردوں کو سزاوار ہے" [۱]

(۱۹) مفکر اسلام مولانا مودودیؒ نے متوفی ۱۳۹۹ھ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ اور بخاری کی یہ حدیث کہ " وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوگی جس نے عورت کو حکمران بنا دیا ہو" نقل کرنے کے بعد لکھا ہے -

" یہ دونوں نصوص اس باب میں قاطع ہیں کہ مملکت میں ذمہ داری کے مناصب خواہ وہ صدارت ہو یا وزارت، یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا مختلف محکموں کی ادارت عورتوں کے سپرد نہیں کئے جا سکتے - اس لئے کسی اسلامی ریاست کے دستور میں عورتوں کو یہ پوزیشن دینا یا اس کے لئے گنجائش رکھنا نصوص صریحہ کے خلاف ہے اور اطاعت خدا اور رسول کی پابندی قبول کرنے والی ریاست اس خلاف ورزی کی سرے سے مجاز ہی نہیں ہے" [۲]

(د) مصر کی جامع ازہر کی کمیٹی برائے افتاء کا فتویٰ

جامع ازہر کے علماء کی ایک کمیٹی مذکورہ بالا آیات و احادیث کی روشنی میں فتویٰ دیا تھا کہ عورت کو سربراہ حکومت بنانا حرام ہے - اس فتویٰ کا ایک فقرہ یہ ہے -

---

[۱] تفسیر معارف القرآن ص ۵۶۱ ج ۶، النمل ۲۳

[۲] اسلامی ریاست طبع ۱۹۸۵ ص ۳۷۹ نیز ص ۵۰۴ تا ۵۱۳

وھذا ھو ما فہمہ اصحاب رسول اللہ وجمیع آئمۃ السلف لم یستثنوا من ذالک امرأۃ ولا قوما فہم جمیعا یستدلون بہذا الحدیث علی حرمۃ تولی المرأۃ الامامۃ الکبری۔

"اس حدیث کا (لن یفلح قوم الخ) یہی مفہوم صحابہ کرام اور تمام آئمہ سلف نے لیا ہے (کہ عورت سربراہ نہیں بن سکتی) انھوں نے اس حکم سے نہ کسی عورت کو مستثنیٰ رکھا ہے اور نہ کسی قوم کو۔ بلکہ ان سب نے حدیث کو اس حکم کی دلیل قرار دیا ہے کہ عورت کو کسی حکومت کا سربراہ بنانا حرام ہے۔"

جامع ازہر کے علماءِ کرام کا فتویٰ

کویت کے ہفت روزہ "المجتمع" نے عورت کی قیادت وحکومت کے بارے میں علماء ازھر کو ایک سوالنامہ بھیجا تھا۔ جس کے جواب میں اس قدیم ترین علمی ادارے کے چار ممتاز علماء کرام نے فتویٰ دیا ہے کہ عورت کی قیادت وحکومت جائز نہیں ہے ان علماء کرام کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

(۱) پروفیسر ڈاکٹر رؤف شلبی۔ پرو وائس چانسلر جامعہ ازہر شریف

(۲) پروفیسر ڈاکٹر حسن شاذلی چیئرمین شعبہ تقابلی مطالعہ قانون جامعہ ازھر شریف

(۳) پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعطی بیومی وائس پرنسپل اصول الدین کالج جامعہ ازھر شریف۔

(۴) پروفیسر ڈاکٹر فؤاد، قانونی مشیر جامعہ ازہر شریف۔

ان چاروں ماہرین شریعت نے قرآن وسنت، اجماع امت، سنت خلفائے راشدین اور عقلی دلائل دے کر ثابت کیا ہے کہ حکمرانی عورت کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ ذمہ داری اللہ نے مردوں پر ڈالی ہے اور عورت کی قیادت وحکومت شرعاً جائز

نہیں ہے۔[1]

(ز) سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز کا فتویٰ

کویت کے ہفت روزہ "المجتمع" کے پیش کردہ سوال کے جواب میں عالم اسلام کے ممتاز عالم دین اور سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز لکھتے ہیں۔

تولية المرأة واختيارها للرّياسة العامة للمسلمين لا يجوز وقد دل الكتاب والسنة والاجماع على ذالك[2]

"عورت کو حکمران بنانا اور حکمرانی کیلئے اسے منتخب کرنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے اور اس پر قرآن کریم، سنت رسول اور اجماع امت دلیل ہے"

اس فتویٰ کے ثبوت میں شیخ موصوف نے قرآن کریم، سنت رسولؐ، خلفائے راشدین کی سنت، اجماع امت اور عقلی دلائل کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ وہی دلائل ہیں جن کی تفصیل میرے اس مقالے کے گذشتہ صفحات میں بیان کر دی گئی ہے۔

اسلامی ممالک کے دساتیر میں سربراہِ حکومت کیلئے مرد ہونا لازمی ہے

جامعہ ازہر کے قانون کے استاد جناب ڈاکٹر فؤاد النادی نے لکھا ہے۔ کہ "یورپین ممالک کے اکثر دساتیر میں تو مرد اور عورت کو ہر لحاظ سے مساوی قرار دیا گیا ہے اور سربراہِ حکومت یا سربراہ ریاست کے لئے مرد ہونا ضروری قرار نہیں دیا گیا

---

[1] ہفت روزہ المجتمع ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء

[2] ہفت روزہ المجتمع ۸ نومبر ۱۹۸۸ء

لیکن مسلمان ممالک میں سے عراق، الجزائر، کویت اور اردن کے دساتیر میں واضح طور پر حکومت کی سربراہی مرد کے لئے مخصوص قرار دی گئی ہے اور تیونس اور شام کے دساتیر کی دفعات کے سیاق وسباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکمران کے لئے مرد ہونا ضروری ہے۔

مصر کے شاہی دور میں نافذ کردہ ۱۹۲۳ء کے دستور میں بھی واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ شاہی تخت کا وارث مرد ہوگا۔ انقلاب کے بعد مصر کے جمہوری دور میں نافذ کردہ ۱۹۵۶ء کے دستور اور ۱۹۶۴ء کے دستور میں اگرچہ اس بارے میں کوئی دفعہ نہیں رکھی گئی بلکہ اسے مبہم ہی رہنے دیا گیا ہے لیکن چوں کہ ۱۹۵۶ء کے دستور کی دفعہ ۳ اور کوئی ۱۹۶۴ء کے دستور کی دفعہ ۵ میں وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ "ریاست کا دین اسلام ہوگا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کا نظام شریعت اسلامیہ کے اصول کی حدود کے اندر اندر بنایا جائے گا تو دستور کی ان دفعات (۱۹۵۶ء کے دستور کی دفعہ ۳ اور ۱۹۶۴ء کے دستور کی دفعہ ۵) سے ثابت ہوتا ہے کہ جمہوریہ مصر کی سربراہی کے لئے عورت کی نامزدگی یا اس مقصد کیلئے اس کا انتخاب جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا اس دین کے اصول کے خلاف ہوگا جسے دستور میں ریاست کا دین قرار دیا گیا ہے مصر کے ۱۹۷۱ء کے دستور میں بھی اگرچہ صریحی طور پر اس بارے میں کوئی دفعہ نہیں رکھی گئی، لیکن اس دستور کی دفعہ ۱۱ میں کہا گیا ہے کہ "شریعت کے احکام کو نقصان پہنچائے بغیر مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہوں گے"۔ اور شریعت تو عورت کی حکمرانی کو ناجائز قرار دیتی ہے تو اس دفعہ گیارہ ۱۱ سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مصر کا دستور عورت کی سربراہی کو جائز قرار نہیں دیتا۔" ڈاکٹر فواد نے اپنی اس آئینی بحث کو ختم کرتے ہوئے فرمایا:

لا یجوز فی ای دولۃٍ اسلامیۃ حتی فی تلک الدول التی ان خلت دساتیرھا من ذکر جنس المرشح لرئاسۃ الدولۃ ان تتولی امرأۃ رئاسۃ الدولۃ باعتبار ان ذالک من النظام العام فی الدول الاسلامیۃ اعمالاً لما تنص علیہ ادلۃ الاحکام التی سبق الاشارۃ الیھا ؏

"کسی اسلامی ملک میں یہاں تک کہ ان اسلامی ممالک میں بھی جن کے آئینی سربراہ ریاست کی نامزدگی کے لئے کسی جنس (مرد یا عورت) کے ذکر سے خالی ہیں۔ یہ جائز نہیں ہے کہ عورت ریاست کی سربراہ بن جائے۔ اس لئے کہ یہ اسلامی ممالک کے عام نظام (دین اسلام) میں از خود شامل ہے۔ (جب کہ آئین میں اسلام کو ریاست کا دین قرار دیا گیا ہو) ان احکام کے دلائل کو روبعمل لانے کی بناء پر جن کی جانب پہلے اشارہ کیا گیا ہے (عورت کی حکمرانی کے عدم جواز کے دلائل) ـــــ "

(ط) پاکستان کے دستور کی رُو سے عورت کو وزیرِ اعظم مقرر نہیں کیا جا سکتا

عالم اسلام کی مشہور جامعہ ازہر کے اس ماہر قانون کی درج بالا آئینی تعبیر سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ کسی دستور میں جب سربراہ حکومت کے استحقاق کے لئے کسی جنس کی تصریح نہ کی گئی ہو، بلکہ اسے مبہم اور غیر واضح چھوڑ دیا گیا ہو۔ لیکن اس دستور میں اسلام کو ریاست کا دین قرار دیا گیا ہو تو اس کے معنی یہی سمجھے جائیں گے کہ اسی کو حکمران بنایا جائے گا جس کی اسلام اجازت دیتا ہو۔

دستور کی اس تعبیر کی روشنی میں اب آیئے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی موضوع

؏ المجتمع شمارہ ۵ ۲ ، اکتوبر ۱۹۸۸ ، ص ۱۷

سے متعلقہ دفعات کا جائزہ لیا جائے۔

دفعہ ۹۱(۲) کے الفاظ یہ ہیں:۔

"صدر اپنی صوابدید کے مطابق قومی اسمبلی کے ارکان میں سے ایک وزیراعظم مقرر کرے گا، جس کے قومی اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کے ارکان کا اعتماد حاصل کرنے کا اس کی رائے میں زیادہ سے زیادہ امکان ہو"

اس دفعہ میں اگرچہ جنس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی بلکہ اسے مبہم اور غیر واضح چھوڑ دیا گیا ہے نہ یہ کہا گیا ہے کہ مرد ارکان میں سے وزیراعظم مقرر کیا جائے گا اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ خاتون ارکان میں سے کسی کو مقرر کرے گا۔ لیکن اسی دستور کی دفعہ ۲ میں کہا گیا ہے کہ:۔

"اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا"

اور دفعہ ۲ (الف) میں قرارداد مقاصد کے اصول و احکام کو دستور کا مستقل اور بحیثیہ مؤثر حصہ قرار دیا گیا اور اس قرارداد میں کہا گیا ہے کہ

"جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا" (ضمیمہ آرٹیکل ۲ (الف)

دفعہ ۲ کا تقاضیٰ یہ ہے کہ مملکت کا نظام اسلام کے مطابق بنایا جائے گا اور دفعہ ۲ الف میں تصریح ہے کہ جمہوریت اور مساوات کے اصولوں کی اسلامی تشریح کو پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا۔ ان دفعات کی روشنی میں ہم جب دفعہ ۹۱(۲) کی تعبیر و تشریح کریں تو ابہام ختم ہوجاتا ہے اور یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ قومی اسمبلی کے مرد ارکان میں سے ایک وزیراعظم مقرر کیا جائے گا۔ اس لئے کہ اسلامی اصول مساوات کی رو سے وزیراعظم بننے کی اہلیت میں مرد اور عورت دونوں مساوی نہیں ہیں، بلکہ

اس منصب کے لئے مرد ہونا شرعاً لازم ہے۔ جب اسلام مملکت کا مذہب ہے اور مساوات کی اسلامی تشریح کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ عورت کو وزیر اعظم مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ وہ قومی اسمبلی کی رکن ہو۔ ورنہ دفعہ ۲ اور دفعہ ۲ الف کی خلاف ورزی عمل میں آجائے گی اور جمہوریت و مساوات کی اسلامی تشریح کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا جا سکے گا۔ اس لئے کہ اسلام کے احکام، عورت کو سربراہِ حکومت بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔

دفعہ ۴۲ کی رو سے صدر اور دفعہ ۹۱(۳) کی رو سے وزیر اعظم اپنے عہدوں پر فائز ہونے سے قبل اپنے اپنے عہدوں کا حلف اٹھائیں گے۔ دستور کے جدول سوم میں مندرج حلف کی عبارت میں مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ وزارت عدل و پارلیمانی امور کی جانب سے دستور کا جو اردو ترجمہ شائع ہوا ہے اس میں صدر اور وزیر اعظم دونوں کے لئے حلف کی عبارت یہ ہے۔

"میں صدق دل سے حلف اٹھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور وحدت و توحید، قادر مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ، کتب الہیہ جن میں قرآن پاک خاتم الکتب ہے، نبوتِ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بحیثیت خاتم النبیین جن کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ روز قیامت اور قرآن پاک اور سنت کی جملہ مقتضیات و تعلیمات پر ایمان رکھتا ہوں۔"

(جدول سوم دفعہ ۴۲ و ۹۱(۳))

اس حلف نامے میں دو جگہ مذکر کا لفظ آیا ہے "اٹھاتا ہوں"، اور "رکھتا ہوں"۔ اگر دستور سازوں کے ذہن میں یہ بات نہ ہوتی کہ پاکستان کا صدر اور وزیر اعظم دونوں مرد ہوں گے تو حلف نامے میں مذکر اور مؤنث دونوں کے صیغے مندرج ہوتے۔ اور اس طرح لکھا جاتا "اٹھاتا/اٹھاتی"، "رکھتا/رکھتی"۔ اگر انگریزی میں ایسا لفظ ہے

بھی، جو مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے تو اردو میں نہ تو اٹھاتا اور رکھتا دونوں کے لئے نہیں آتا۔ نیز جب صدر اور وزیر اعظم دونوں نے یہ حلف اٹھایا ہے کہ میں قرآن پاک اور سنت کی جملہ مقتضیات و تعلیمات پر ایمان رکھتا ہوں تو اس کے معنی یہی ہیں کہ جو شخص قرآن و سنت کی تعلیمات کی رو سے صدر یا وزیر اعظم بننے کا اہل نہ ہو۔ وہ اگر حلف اٹھاتا ہے تو وہ حلف کے تقاضے کو عین حلف اٹھاتے وقت بھی پس پشت ڈال رہا ہے۔ اگر حلف اٹھانے کے وقت اسے اپنی نااہلیت کا علم نہیں تھا تو جب بھی اسے اس کا علم حاصل ہو جائے تو اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صدارت یا وزارت عظمیٰ کا عہدہ چھوڑ دے۔ اسلام میں چوں کہ عورت صدر یا وزیر اعظم نہیں بن سکتی اور یہ قرآن و سنت کی تعلیمات میں شامل ہے اس لئے جو عورت صدارت یا وزارت عظمیٰ کا درج بالا الفاظ میں حلف اٹھاتی ہے تو یہ اپنے حلف کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ یاد رہے کہ حکمرانی کے لئے مرد ہونے کی شرط کوئی اجتہادی اور اختلافی شرط نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہے اور ان نصوص کی بنا پر اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کا اجماع ہے کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی۔ اس لئے یہ حکم قرآن و سنت کی قطعی تعلیمات میں شامل ہے اور یہ اسلام کا قطعی حکم ہے جس پر ایمان رکھنا از روئے دستور صدر اور وزیر اعظم کے لئے ضروری ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور آئینی نکتہ بھی ملاحظہ کیجئے اور وہ یہ ہے کہ آئین کی دفعہ ۴۱ (۲) میں صدر مملکت کے لئے پھر مسلمان ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے لیکن دفعہ ۹۱ میں وزیر اعظم کے لئے مسلمان ہونے کی صراحت موجود نہیں ہے۔ مگر جدول سوم میں صدر اور وزیر اعظم دونوں کے حلف کی عبارت میں مسلمان ہونے کا اقرار شامل ہے اب اگر کوئی یہ کہے کہ وزیر اعظم کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے اس لئے کہ وزیر اعظم کے

تقرر سے متعلق دفعہ ۹۱ میں یہ شرط موجود نہیں ہے۔ بلکہ صرف رکن اسمبلی ہونا اور اسمبلی کے اکثر ارکان کا معتمد ہونا شرط ہے۔ ارکان اسمبلی کی اکثریت اگرچہ مسلمان ہو گی اس لئے کہ پاکستان کے عوام کی اکثریت مسلمان ہے اور غیر مسلم اقلیتوں کیلئے الگ نشستیں مخصوص ہیں۔ مگر امکان تو اس کا بھی ہے کہ کوئی غیر مسلم رکن اسمبلی وزیر اعظم کے عہدے کا امیدوار بن جائے اور اسمبلی کے ارکان کی اکثریت مسلمان ہوتے ہوئے بھی اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس اشکال کا یہی جواب دیا جائے گا کہ دفعہ ۹۱ میں اگرچہ مسلمان ہونے کی شرط مذکور نہیں ہے لیکن دفعہ ۹۱ (۳) کے تحت کوئی شخص وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال نہیں سکتا جب تک کہ وہ جدول سوم میں دی گئی عبارت میں حلف نہ اٹھائے اور حلف کی عبارت میں مسلمان ہونے کی صراحت موجود ہے۔ لہذا دفعہ ۹۱ (۲) کو دفعہ ۹۱ (۳) کے تحت جدول سوم میں دی گئی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ وزیر اعظم کے لئے بھی صدر کی طرح مسلمان ہونا شرط ہے۔

اسی طرح وزیر اعظم کے لیئے مرد ہونا اگرچہ دفعہ ۹۱ میں شرط قرار نہیں دیا گیا مگر اسی دفعہ ۹۱ (۳) کے تحت جدول سوم میں دی گئی حلف نامے کی عبارت میں مذکر کا صیغہ صراحتہً مذکور ہے تو جدول کی اس عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ وزیر اعظم اور صدر دونوں کے لئے از روئے آئین مرد ہونا ضروری ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اسلام میں کیا صدر اور وزیر اعظم کا مرد ہونا شرط ہے یا نہیں تو پاکستان بلکہ عالم اسلام کے ماہرین شریعت کہتے ہیں کہ مرد ہونا شرط ہے اور پیپلز پارٹی والے کہتے ہیں کہ اسلام میں عورت بھی صدر یا وزیر اعظم بن سکتی ہے تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ عوام سے پوچھیں کہ تم اسے جائز سمجھتے ہو یا نہیں؟ بلکہ اس تنازعے کے حل کے لئے قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا ہے

کہ دین کے کسی مسئلے کے بارے میں اگر تمہارے درمیان تنازعہ پیدا ہو جائے تو قرآن و سنت کی طرف رجوع کرو۔ یہ نہیں فرمایا کہ دینی مسئلے میں عوام کی عدالت میں جاؤ۔

میں نے اپنے اس مقالے میں قرآن و سنت اور ماہرین قرآن و سنت کا فیصلہ حوالوں کے ساتھ نقل کر دیا ہے کہ سربراہ حکومت کے لئے مرد ہونا ہونا لازمی شرط ہے۔ اگر محترمہ بے نظیر قرآن و سنت کے فیصلے کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا چاہتی ہے تو یہ عہدہ چھوڑ دے اور اپنی ہی پارٹی کے کسی مرد کو وزیراعظم مقرر کروا دے۔

۳۔ شبہات اور اُن کا ازالہ

مثبت انداز میں تو گزشتہ صفحات پر یہ مسئلہ مدلّل طور پر واضح ہو چکا ہے۔ لیکن پاکستان میں جب عورت کی سربراہی کا یہ فتنہ رونما ہو چکا ہے تو کچھ صحافیوں نے اخبارات و رسائل میں اس علمی اور دینی مسئلے کو بھی اپنی صحافت کے لئے تختۂ مشق بنا لیا ہے اور اپنی عادت کے مطابق سطحی قسم کے استدلال کو اخباری اور صحافتی انداز میں چھاپنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے اخبارات و رسائل میں اس موضوع پر بعض مضامین پڑھے ہیں اور بعض کے بارے میں سنا ہے۔ ان سب کا قدرِ مشترک کچھ شبہات ہیں جن کو انھوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر دلائل کا نام دے دیا ہے۔ یہ شبہات دراصل مغربی جمہوریت کے وہ جراثیم ہیں جو ہمارے مسلمان معاشرے میں پھیل گئے ہیں اور ان جراثیم نے کچھ لوگوں کو ذہنی بیماری میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس نوع کے ممکنہ شبہات کے جوابات دے دیئے جائیں تاکہ متلاشیانِ حق کا ذہن صاف ہو جائے۔ ان شبہات کے ازالے کے لئے مضمون نویسوں کے ناموں کا یا ان کے مضامین کے حوالوں کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ جن جن شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان ہے ان کا ذکر کیا جائے گا اور پھر ان کے جوابات درج کیے جائیں گے۔

(۱) مرد اور عورت کی مساوات کو سندِ جواز بنانا

(۱) آج کل سب سے بڑا نعرہ یہ لگایا جا رہا ہے کہ قرآن کریم نے مرد و زن کی ہر لحاظ سے اور ہر میدان میں مساوات اور برابری کا اصول پیش کیا ہے اور اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ مرد اور عورت حکمرانی کرنے کے حق میں بھی مساوی ہوں اور عورت کو اس حق سے محروم کرنا حق تلفی ہے اور ظلم ہے۔

جواب

مرد اور عورت دونوں انسانی کرامت و شرافت میں برابر ہیں "ولقد کرمنا بنی آدم" "اور بے شک ہم نے کرامت اور شرافت دی ہے اولادِ آدم کو" اور ایمانی شرافت میں بھی دونوں برابر ہیں۔ اگر ایمان و تقویٰ میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں تو دونوں کا اجر اور تقویٰ بھی اللہ کے ہاں برابر ہے۔ بلکہ اگر کوئی عورت ایمان اور تقویٰ میں مرد سے آگے ہے تو اس کا اجر اور مرتبہ بھی ایمان و تقویٰ میں پیچھے رہ جانے والے مرد سے بڑا ہو گا۔ اسی طرح بنیادی انسانی حقوق میں جو اللہ اور رسولؐ نے متعین کیے ہیں۔ ان میں بھی دونوں برابر ہیں۔ لیکن قرآن و سنت نے یہ نہیں کہا کہ صلاحیتوں اور ذمہ داریوں میں بھی مرد اور عورت ہر لحاظ سے برابر ہیں۔ قرآن و سنت میں تو یہ آیا ہے کہ عورت کی عقلی اور ذہنی صلاحیتیں مردوں سے بالعموم کم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے نصف ہے۔ شریعت نے مرد اور عورت کے فرائض میں فرق اور تنوع رکھا ہے۔ عورت کی ذمہ داری گھر کا نظام چلانا ہے اور مرد کی ذمہ داری معاش کے وسائل فراہم کرتا ہے۔ عورت پر تو اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس پر "سیاست البیت" کے ساتھ "سیاست المدن" کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔ یعنی گھر سنبھالنے اور بچوں کی پرورش کی

ذمہ داری کے ساتھ سربراہ مملکت، سربراہ حکومت، گورنر اور کمانڈر انچیف کی بھاری ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی گئی ورنہ دونوں کو ایک ساتھ نبھانا مشکل ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ بوجھ کم کرنا حق تلفی اور کم تر یا حقیر سمجھنا نہیں ہے بلکہ ایک احسان ہے جس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اپنے کندھوں پر مزید بوجھ بڑھانے کا مطالبہ کرنا۔ اور اگر اس پر مزید بوجھ نہ ڈالا جائے تو احتجاج کرنا دانشمندی تو نہیں ہے بلکہ دیوانگی کی علامت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسانی کرامت، ایمانی شرافت اور حقوق میں مرد و زن کی مساوات کی تعلیم دی ہے۔ لیکن ذمہ داریوں اور فرائض میں یکسانیت نہیں رکھی بلکہ تنوع اور تقسیم کار کا اصول پیش کیا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان عبادات میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرق رکھا ہے۔ مردوں پر نماز جمعہ اور نماز جنازہ ادا کرنا فرض ہے لیکن عورتوں پر یہ فرائض عائد نہیں کئے گئے۔ اس کی وجہ عورتوں کی گھریلو ذمہ داریاں ہیں۔ اسی طرح عورتوں پر نماز با جماعت کے لئے مسجد میں آنا لازم نہیں ہے۔ اگر عورت کے ساتھ جانے والا محرم موجود نہ ہو یا اسے ساتھ لے جانے کی استطاعت نہ ہو تو عورت پر حج بھی فرض نہیں ہے۔ اب اگر عورتیں احتجاج کرنا شروع کر دیں کہ ہم پر جمعہ، عیدین اور جنازے کی نمازیں کیوں فرض نہیں کی گئیں اور یہ بوجھ ہم سے کم کیوں کیا گیا ہے۔ یہ تو ہماری حق تلفی ہے، ہم پر ظلم ہے۔ اور ہماری بے عزتی ہے تو اس احتجاج کا جواب یہ ہوگا کہ یہ تم اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ذمہ داریوں میں کمی کر دی ہے۔ حقوق تمہارے برابر ہیں۔ لیکن فرائض مردوں سے کم ہیں۔ آخر یہ حق تلفی کیسے ہو گئی؟

مغرب نے ہم کو یہ نرالا سبق بھی پڑھایا ہے کہ حکومت کا منصب ایک حق ہے جس میں مرد و زن دونوں برابر ہیں۔ حالاں کہ یہ حق نہیں ہے بلکہ ایک ڈیوٹی ہے اور فرض ہے۔ جو دوسری ذمہ داریوں کی وجہ سے عورتوں پر نہیں ڈالا گیا۔ یورپ کے اسی غیر فطری نظام کی وجہ سے ان کا گھریلو اور خاندانی نظام بگڑا ہوا ہے اور ان کا معاشرہ حیوانی معاشرے

کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ اللّٰھم احفظنا منھا۔

(ب) خلافت و امارت سے متعلق آیات کے عام ہونے کو سندِ جواز بنانا

(۲) بعض مضمون نگاروں نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں خلافت و امارت یعنی حکومت کے بارے میں جو آیات آئی ہیں۔ ان میں مرد اور عورت کے درمیان فرق نہیں کیا گیا بلکہ عام الفاظ میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ مثلاً

وعد اللہ الذین اٰمنو امنکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔ النور ۵۵

"وعدہ کیا ہے اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کئے ہیں کہ وہ ان کو حکومت دے گا زمین پر جیسا کہ حکومت دی تھی اس نے ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں"

یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (النساء ۵۹

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور حکمرانوں کی جو تم میں سے ہوں"

الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور (الحج ۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو حکومت دے دیں زمین پر، تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے اور اللہ کے پاس ہے نتیجہ سب کاموں کا"

ان آیات اور اس مضمون کی دوسری آیات اور احادیث میں خلافت، امارت، اور تمکین یعنی حکومت اور اقتدار کی نسبت عام مسلمانوں کی جانب کی گئی ہے جن میں

مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ اس عمومی خلافت سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد بھی اس خلافت کا اہل ہے۔ اور عورت بھی اس کی اہل ہے۔ صیغے اگرچہ مذکر کے آئے ہیں مگر قرآن کی اصطلاح یہ ہے کہ مذکر کے صیغوں کے عموم میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں یہ ہے اس استدلال کا خلاصہ جو بعض صحافیوں نے اپنے مضامین میں پیش کیا ہے۔

جواب

ان آیات سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ان کی رائے سے بنے گی اور اس کی تشکیل میں سب کی رائے اور رضامندی شامل ہوگی۔ اس احساسِ شرکت سے تمام مسلمان خواہ مرد ہوں یا عورتیں ہوں اس حکومت کو اپنی حکومت سمجھیں گے کہ اس کے قیام میں بھی ان کی رائے اور پسند شامل ہوگی اور اس کی برکات سے بھی سب کے سب فائدہ اٹھائیں گے۔ دراصل عمومی خلافت کے اس قرآنی تصور سے ملوکیت اور آمریت کی جڑ کاٹی گئی ہے۔ بادشاہت اور آمریت یا تو میراث میں ملتی ہے یا تلوار کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے یا پھر سازش کے ذریعے غصب کی جاتی ہے۔ ایسی حکومت کے قیام میں چونکہ عام مسلمانوں کی رائے اور ان کی پسند شامل نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ ایک خاندان یا ایک فرد کی حکومت ہوتی ہے۔ عام مسلمان اسے اپنی حکومت نہیں سمجھتے۔ ان آیات کے وہی معنی ہیں جو قرآن کریم کی دوسری آیت وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کی حکومت مشورے سے (مسلمانوں کی رائے سے) بنے گی اور مشورے سے چلے گی۔ رائے دہی کے حق میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ قرآن وسنت میں عورتوں کو رائے دہی کے حق سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ باقی رہی سربراہ حکومت کی شرائط اہلیت تو ان کا ذکر ان آیات میں نہیں ہوا۔ اس کے لئے ہمیں دوسری آیات اور احادیث کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ دوسری آیات واحادیث میں سربراہ حکومت کے لیے ضروری قرار

دیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہو، مرد ہو، عالم دین ہو، پرہیز گار ہو اور جسمانی و ذہنی صلاحیتوں میں دوسروں پر فوقیت رکھتا ہو۔ گذشتہ صفحات میں ان صفات کے دلائل کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ اگر ان آیات کے عام ہونے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت بھی حکمران بن سکتی ہے تو پھر ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان پڑھ، لاعلم شخص یا جسمانی طور پر معذور شخص بھی حکمران بن سکتا ہے اس لئے کہ اس عموم میں تو یہ بھی شامل ہے۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن کی دوسری آیات کی روشنی میں کی جانی چاہیئے یا احادیث نبویہ کی روشنی میں آیات کا مفہوم متعین کرنا چاہیئے۔ یہی صحیح اور معقول طریقہ ہے۔ قرآن کو سمجھنے کا جب دوسری جگہ اللہ نے خود فرما دیا ہے کہ "مرد حکمران ہیں عورتوں پر" اور مردوں کو صلاحیتوں اور ذمہ داریوں میں عورتوں پر فوقیت حاصل ہے ؎ وللرجال علیھن درجۃ۔ اور عورتوں کا دائرہ کار گھر قرار دیا گیا ہے۔ و قرن فی بیوتکن۔ اسی طرح رسول اللہ نے بتا دیا ہے کہ حکمرانی مردوں کی ذمہ داری ہے۔ تو ان آیات و احادیث کے ہوتے ہوئے خلافت و امارت سے متعلق آیات کے عموم سے کیسے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ عورت بھی حکمران بن سکتی ہے۔ شورائی نظام اور جمہوری حکومت پوری قوم کی حکومت کہلاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ پوری قوم کی رائے سے بنتی ہے اور پوری قوم اس حکومت سے استفادہ کرتی ہے۔ لیکن عملاً حکومت کا نظم و نسق چلانے والا سربراہ ایک ہی ہوتا ہے اور حکومت کی مشینری کو چلانے والا بھی سربراہ ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں حکومت کے سربراہ کے لئے اہلیت کا ایک معیار ہوتا ہے۔ قوم اس معیار پر پورا اترنے والے شخص کو اپنا سربراہ بناتی ہے اور پھر اپنے اس منتخب کردہ شخص کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتی ہے اور اسلامی معاشرے میں سربراہ کی شرائط میں اس کا مرد ہونا بھی شامل ہے۔

(۳) ملکہ بلقیس کی حکومت کو سندِ جواز بنانا

بعض حضرات نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں قوم سبا پر ایک خاتون ملکہ بلقیس کی حکمرانی کا ذکر آیا ہے اور قرآن کریم نے اس کی حکومت پر نکیر نہیں کی، تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن نے خاتون کی حکمرانی کو جائز قرار دیا ہے۔

جواب

محترمہ بے نظیر کے ان وکیلوں کی خدمت میں میری درخواست ہے کہ اگر یہ اپنے پیشۂ وکالت کی مجبوریوں کی وجہ سے اپنا ذہن نہیں بدل سکتے تو کم از کم اتنی مہربانی کریں کہ قرآن کے مفہوم کو بدلنے کی کوشش نہ کریں۔ آخر پیشہ وکالت کے اور بھی تو گُر آپ کو آتے ہیں انہیں استعمال کرو۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ انبیاء سابقین یا ان کے ماننے والوں میں سے کسی مومن کا قول یا عمل جب قرآن و سنت میں بغیر نکیر و تردید کے نقل ہوا ہو تو وہ قول و عمل ہمارے لیے بھی سندِ جواز ہوتا ہے۔ لیکن اگر مشرکین میں سے کسی کا قول و عمل قرآن و سنت میں نقل ہوا ہو تو وہ جواز کی دلیل نہیں بن سکتا۔ جب تک کہ قرآن و سنت نے اس کی تائید نہ کی ہو۔

سورہ نمل کی آیت ۲۳ میں ملکہ بلقیس کی حکومت کا ذکر یقیناً آیا ہے لیکن اس کے بعد آیت ۲۴ میں اس کے مشرک ہونے کا ذکر بھی تو آیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے

وجدتها وقومها یسجدون للشمس

"ہدہد نے کہا۔ میں نے پایا اس عورت کو اور اس کی قوم کو کہ سجدہ کرتے ہیں سورج کو۔"

کیا سورج کے پجاریوں کا عمل نقل کرنا شرعی دلیل بن سکتا ہے۔ بلقیس مشرک قوم

کی سربراہ تھی۔کسی مسلمان قوم کی سربراہ نہ تھی۔اگر مشرکین کا طرز عمل حجت بن سکتا ہے تو پھر دور جانے کی ضرورت کیا ہے۔خود ہمارے زمانے میں بعض مشرک قوموں پر عورتیں حکمران رہی ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ ایمان لانے کے بعد سلیمانؑ نے بلقیس سے شادی کرلی تھی۔ اور اسے اپنی سابقہ حکومت پر بحال کر دیا تھا تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ سورۃ نمل کی آیت نمبر ۴۴ میں بلقیس کے مسلمان ہو جانے کا ذکر تو آیا ہے لیکن سلیمانؑ کے ساتھ نکاح کرنے اور سابقہ حکومت پر برقرار رکھنے کا ذکر قرآن میں کسی جگہ بھی نہیں آیا اور کسی صحیح الاسناد حدیث رسول میں بھی اس کا ذکر نہیں آیا۔روح المعانی میں آیا ہے کہ عبداللہ بن عتبہؓ سے کسی نے پوچھا کہ کیا بلقیس سے سلیمانؑ نے نکاح کر لیا تھا تو اس نے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ایمان لانے کے ذکر پر اس کا قصہ ختم کر دیا ہے۔آگے کچھ بھی نہیں فرمایا۔اس لیے ہمیں بھی اس سے آگے کچھ نہیں کہنا چاہیئے!

جب قرآن وسنت نے اسلام لانے کے بعد بلقیس کی حکومت کا ذکر نہیں کیا صرف حالت کفر میں حکومت کرنے کا ذکر کیا ہے تو آخر ایک فرضی بات کو کیسے دلیل بنایا جا رہا ہے، جب کہ قرآن وسنت سے ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ شریعت محمدیہ میں عورت کو سربراہ بنانا جائز نہیں ہے۔بالفرض اگر بلقیس نے ایمان لانے کے بعد بھی سلیمان کی ماتحتی میں حکومت کی ہو تو ہماری شریعت میں تو ممنوع ہے۔شریعت سلیمانیہ کا حکم جب شریعت محمدیہ کے خلاف ہو تو وہ ہمارے لئے حجت نہیں ہے۔ ع

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد۔

باقی رہے مورخین تو ان کے اقوال بھی مختلف ہیں:۔

امام قرطبیؒ نے ضحاک بن مزاحم کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ سلیمانؑ نے بلقیس سے نکاح کرنے کے بعد اسے اپنے شام میں رکھا تھا[1]

ابن الاثیر جزریؒ متوفی ۶۳۰ھ نے لکھا ہے:۔

ونکحها سلیمانؑ واحبها حبا شدیدا وردها الی ملکها بالیمن وقیل زوجها ذا تبع ملک همدان وسلط زوجها ذا تبع علی الملک[2]

"سلیمانؑ نے بلقیس سے نکاح کر لیا تھا وہ اس سے شدید محبت کرتے تھے اور اس نے اسے یمن کی حکومت پر لوٹا دیا تھا۔ لیکن بعض مؤرخین نے کہا ہے کہ سلیمانؑ نے اس کا نکاح ہمدان کے حکمران تبع سے کروا دیا تھا اور حکومت پر اس کے شوہر تبّع کو مقرر کر دیا تھا"

ابن کثیرؒ نے ابن الاثیر کا نقل کردہ پہلا قول ثعلبی سے نقل کیا ہے اور دوسرا قول مشہور امام محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے[3]

امام قرطبیؒ نے مذکورہ تاریخی اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:۔

وقال قوم لم یرد فیه خبر صحیح[4]

"ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اس بارے میں کوئی بھی صحیح خبر موجود نہیں ہے"

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ بلقیس کے بارے میں قرآن کریم میں بیان کردہ قصے سے زائد جو تاریخی روایات آئی ہیں وہ اسرائیلیات ہیں۔ یعنی یہودیوں کی پھیلائی ہوئی روایات ہیں۔ سلف صالحین میں سے جن بزرگوں نے یہ روایات

---

[1] تفسیر قرطبی ص ۲۱۰ ج ۱۳

[2] الکامل لابن الاثیر ص ۲۲۷-۲۲۸ ج ۱ [3] البدایة والنهایة از ابن کثیر ص ۲۴ ج ۲ [4] قرطبی ص ۲۱۱ ج ۱۳

نقل کی ہیں۔ وہ صرف حکایت کے طور پر نقل کی ہیں۔ امر واقعہ کے طور پر نقل نہیں کیں۔ ظاہر ہے کہ اسرائیلی روایات کی بنیاد پر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ بلقیس نے ایمان لانے کے بعد بھی یمن پر حکمرانی کی تھی۔

اگر ایک مفروضے کے طور پر یہ مان لیا جائے کہ اس نے مسلمان ہونے کے بعد یمن پر حکومت کی تھی تو سوال یہ ہے کہ جب یمن کو سلیمانؑ نے اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا تو کیا اس کے بعد بھی یمن پر بلقیس یا کسی اور شخص کی آزاد اور خود مختار حکومت باقی رہ سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ سلیمانؑ کا اصل مقصد صرف بلقیس کے شاہی تخت پر قبضہ کرنا یا اس سے شادی کرنا تو نہیں تھا جس کے لیے اس نے جنگ کا الٹی میٹم دیا تھا اور اس کا تخت منگوایا تھا۔ بلکہ اصل مقصد تو اسلام کا نفاذ تھا اور اہل یمن کو اسلام کے دائرے میں لانا تھا تو کیا یہ ممکن ہے کہ بلقیس کے اسلام لانے کے بعد یمن کو سلیمانؑ نے اپنی حکومت کی حدود سے نکال دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا کہنا ایک غیر معقول بات ہے۔ حکومت یمن پر بھی سلیمانؑ کی تھی۔ اور شام و فلسطین پر بھی اسی کی تھی۔ بلقیس کو اس کے ملک پر برقرار رکھنے کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اس کا پرانا اعزاز بحال رکھا تھا اور وہ جو کام کرتی تھی سلیمانؑ کی ہدایات کے مطابق کرتی تھی۔ اس کا منصب سربراہ حکومت یا سربراہ ریاست کا نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کہ سربراہی تو سلیمانؑ کی تھی یمن پر بھی اور شام پر بھی۔ یہ توجیہہ تو ہیں نے صرف اس مفروضے کو سامنے رکھ کر کی ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی بلقیس نے یمن پر حکومت کی تھی۔ ورنہ یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقت تو صرف وہی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہوا ہے کہ اسلام لانے سے قبل بلقیس یمن کی ملکہ تھیں۔

۴۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی امداد الفتاویٰ کو سندِ جواز بنانا

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ متوفی ۱۳۶۲ھ نے ۱۳۳۰ھ میں عورت کی حکمرانی کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیا تھا جسے آج بے نظیر کے شیدائی وسیع پیمانے پر پھیلا رہے ہیں۔ اور اس فتوے کو بنیاد بنا کر مضمون نگار اپنی مضمون نویسی کا پورا زور لگا رہے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ مضمون نگار مولانا تھانوی کی بہشتی زیور میں عورتوں کے بارے میں لکھی گئی تحریروں کو بھی اپنی مضمون نگاری کا موضوع بناتے مگر ان صحافیوں کو تو مولانا تھانوی کی وہی تحریر پسند آ گئی ہے جو محترمہ بے نظیر کی خواہش کے مطابق ہے۔ بہرحال «وللناس فیما یعشقون مذاہب»۔ سب سے پہلے مولانا تھانویؒ کے جواب کی ایک جامع تلخیص پیش کی جا رہی ہے اور پھر اس پر تبصرہ کیا جائے گا۔

«۔ جمہوری حکومت میں عورت حکمران بن سکتی ہے اس لئے کہ جمہوری حکومت کی حقیقت مشورہ ہے اور عورت مشورہ دینے کی اہل ہے۔ بلقیس کی حکومت کا طرزِ عمل جمہوری تھا۔ چوں کہ کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ اسلام لانے کے بعد سلیمانؑ نے اس کی حکمرانی ختم کر دی تھی۔ اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکمرانی ایمان لانے کے بعد بھی برقرار تھی اور اس کا برقرار رہنا جمہوری حکومت میں عورت کی حکمرانی کے جواز کی دلیل ہے۔ حدیث میں عورت کو گھر کی نگران (راعیہ) کہا گیا ہے یہ بھی ایک نوع کی حکومت ہی ہے۔ لیکن یہ کامل حکومت (ولایۃ کاملہ) نہیں ہے۔ بلکہ ایک قسم کی نگرانی ہے۔ تو اس پر جمہوری حکومت کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی ولایتہ کاملہ (کامل حکومت) نہیں ہوتی بلکہ محض مشورہ اور نگرانی ہوتی ہے۔ فقہاءؒ نے امامۃ الکبریٰ یعنی کامل

حکومت کے لیے تو مرد ہونا شرط قرار دیا ہے لیکن نگرانی (نظارت) اور شہادت کے لیے مرد ہونا شرط قرار نہیں دیا۔ رسول اللہؐ کا یہ ارشاد کہ "وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوگی جس نے عورت کو اپنا حکمران بنا دیا ہو"، ولایت کاملہ یعنی کامل حکومت کے بارے میں ہے جو صرف مشورہ دینا اور نگرانی کرنا نہیں ہوتی بلکہ کامل اور مکمل حکمرانی ہوتی ہے جمہوری حکومت چونکہ محض مشورہ اور نگرانی ہوتی ہے، کامل حکومت نہیں ہوتی اس لیے اس پر یہ حدیث منطبق نہیں ہو سکتی۔" [1]

یہ ہے حضرت تھانویؒ کی اس تحقیق کا خلاصہ اور مفہوم جو انھوں نے اپنی وفات سے ۲۲ سال قبل ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمائی تھی۔ اب اس پر تبصرہ ملاحظہ کیجئے۔

حضرت تھانویؒ کے فتویٰ کا تجزیہ اور اُس پر تبصرہ

حضرت تھانویؒ کی تحریر کا تجزیہ کرنے سے قبل درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔ جن کو انھوں نے اپنے پرانے فتوے کی بنیاد قرار دیا ہے۔

(الف) رسول اللہؐ کی حدیث کامل حکومت (ولایت عامۃ کاملہ) کے بارے میں آئی ہے اور فقہاء کرامؒ نے بھی امامۃ کبریٰ (کامل حکومت) کے لیے مرد ہونے کی شرط لگائی ہے۔ نگرانی، وصیت اور شہادت کے لیے یہ شرط نہیں لگائی۔

(ب) جمہوری حکومت گھر کی نگرانی اور شوہر کے مال و اولاد کی نگہداشت کی طرح محض مشورہ دینا اور نگرانی کرنا ہے۔ کامل حکومت نہیں ہے۔ چونکہ عورت مشورہ دینے اور نگرانی کی اہل ہے۔ اس لیے وہ جمہوری حکومت کی بھی

---

[1] امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۹۱ تا ۹۳۔ تتمہ ثانیہ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ۔

اہل ہے۔

(ج) بلقیس کی حکومت جمہوری طرز کی تھی۔ ایمان لانے کے بعد اسے معزول کرنا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکمرانی برقرار تھی۔ اور اس کا ایمان لانے کے بعد اپنی جمہوری حکومت پر برقرار رہنا اس بات کی دلیل بن سکتی ہے کہ جمہوری حکومت کا سربراہ بننا عورت کے لئے جائز ہے۔

حضرت تھانویؒ نے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ حدیث رسولؐ اور فقہاء کے قول سے ثابت ہوتا ہے کہ امامت کبریٰ یعنی کامل حکومت کی سربراہی کے لئے مرد ہونا شرط ہے لیکن ان کو غلط فہمی اور اشتباہ یہ پیش آگیا ہے کہ جمہوری حکومت ایک کامل حکومت اور امامت کبریٰ نہیں ہوتی بلکہ محض مشورہ اور نگرانی ہوتی ہے۔ حالاں کہ آج کل کی جمہوری اور پارلیمانی طرز کی حکومتوں میں وزیراعظم ولایۃ کاملہ اور ولایۃ عامہ رکھنے والا کامل اور مکمل حکمران ہوتا ہے۔ صرف مشورہ دینے والا اور نگرانی کرنے والا نہیں ہوتا۔ وزیراعظم اپنے صوابدید پر کابینہ کے وزرا مقرر کرتا ہے اور جب چاہتا ہے انہیں برخاست کر کے نئے وزراء مقرر کر لیتا ہے۔ داخلہ امور اور خارجہ امور کی جو پالیسی وہ بناتا ہے حکومت کی پوری مشینری اور کابینہ اسی کی پابند ہوتی ہے۔ اسمبلی میں وزیراعظم کی منظوری کے بغیر نہ کوئی بجٹ پیش ہو سکتا ہے اور نہ کوئی سرکاری بل پیش ہو سکتا ہے۔ ملک کی فوج اور پولیس اور دوسرے تمام ریاستی وسائل وزیراعظم کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرنا، ملکی اور غیر ملکی دورے کرنا، بین الاقوامی معاہدے کرنا اور جنگ و صلح کے فیصلے کرنا، یہ سب وزیراعظم کے فرائض میں شامل ہوتے ہیں۔ جمہوری حکومتیں ایک قسم کی کلیت پسند اور ہمہ گیر حکومتیں ہوتی ہیں۔ صرف مشورہ اور نگرانی کرنے والی نہیں ہوتیں۔ حضرت تھانویؒ نے یہ سمجھ لیا ہوگا

کہ عورت مشورہ اور نگرانی گھر میں بیٹھے ہوئے بھی کر سکتی ہے اس لئے اسے "قرار فی البیت" اور دوسرے احکام کی خلاف ورزی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی حالانکہ صورت حال ایسی نہیں ہے۔ پھر قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ:۔

غیر جمہوری یعنی شخصی بادشاہت تو اسلام میں فی نفسہ ناجائز ہے۔ خواہ حکمران مرد ہو یا عورت۔ موروثی بادشاہت یا آمرانہ حکومت تو اسلام کے سیاسی اصول سے سرے سے کوئی مطابقت ہی نہیں رکھتی۔ فقہاء اسلام اور علماء علم الکلام نے قرآن و سنت کی روشنی میں حکمران کے لئے مرد ہونے کی جو شرط لگائی ہے جسے حضرت تھانویؒ نے بھی تسلیم کیا ہے وہ اسلامی حکومت کے لئے لگائی ہے جو ظاہر ہے کہ شورائی اور جمہوری ہوتی ہے۔ شخصی بادشاہت اور آمریت تو نہیں ہوتی۔ شخصی آمریتوں یا موروثی بادشاہتوں کو حالات کے دباؤ یا قانون ضرورت کے تحت وقتی طور پر گوارا کر لینے کی اجازت تو فقہاء نے دی ہے۔ لیکن اسے صحیح معنوں میں اسلامی حکومت نہیں سمجھا گیا۔ جب غیر جمہوری حکومت فی نفسہ ناجائز ہے تو اس کے لئے مرد کی شرط لگانا ایک بے معنی سی بات ہے۔

گھر کی نگرانی (نظارت اور حضانہ) عورت کے لئے جائز ہی نہیں ہے بلکہ یہ اس کی اصل ذمہ داری اور یہی گھر اس کا اصل دائرہ کار ہے۔ لیکن پورے ملک پر حکومت کرنا اگرچہ جمہوری طریقے کے مطابق ہو، نگرانی نہیں ہے بلکہ کامل اور ہمہ گیر حکومت ہے اس لئے سیاستہ المدن یعنی پورے ملک پر حکمرانی کرنے کو سیاست البیت یعنی گھریلو امور کی نگرانی کرنے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ ولایۃ عامہ اور ولایۃ خاصہ کے درمیان فرق کو حضرت تھانوی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بس یہی فرق ہے سیاستہ المدن اور سیاستہ البیت کے درمیان۔

باقی رہا بلقیس کی حکومت کو سندِ جواز بنانا، تو اس سلسلے میں غور طلب بات یہ ہے،

کہ اس کی حکومت صرف مشورہ دینے اور نگرانی کرنے کی حد تک محدود نہیں تھی بلکہ تمام امور میں فیصلے کا اختیار اس کے ہاتھ میں تھا۔ ارشاد خداوندی ہے۔

"ملکہ نے کہا۔ اے سردارانِ قوم! مجھے مشورہ دو میرے اس معاملے میں میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا کرتی جب تک موجود نہ ہو۔ وہ کہنے لگے ہم تو بڑے طاقتور اور سخت جنگجو ہیں اور فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ خود غور کریں کہ آپ کیا حکم دینا چاہتی ہیں۔" (النمل ۳۲-۳۳)

قرآن کریم کی ان آیتوں میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ بلقیس مشورہ دینے والی اور نگرانی کرنے والی ملکہ نہیں تھی۔ بلکہ حتمی فیصلہ اسی کے اختیار میں تھا۔ وہ حکم دیتی تھی اور قوم اس کی تعمیل کرتی تھی۔ البتہ اس میں مشرکہ ہونے اور موروثی ملکہ ہونے کے باوجود یہ خوبی موجود تھی کہ حتمی فیصلہ کرنے اور حکم صادر کرنے سے قبل اپنی قوم کے نمائندوں سے مشورہ طلب کر لیتی تھی۔

سلیمان ؑ کے خط کا جواب دینے سے قبل جب اس نے قوم کے سرداروں سے مشورہ طلب کیا تو انھوں نے صرف اپنی بہادری اور جوانمردی کے جوہر دکھانے اور حکم کی تعمیل کے عزم کا اظہار تو کیا تھا مگر کوئی تدبیر نہیں بتائی تھی۔ بلقیس نے از خود حتمی فیصلہ یہ سنایا کہ "میں ان کی طرف تحفے دے کر قاصد بھیجتی ہوں۔ پھر دیکھوں گی کہ قاصد کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔" (النمل ۳۵)

صرف مشورہ دینے والی اور نگرانی کرنے والی ملکہ ایسی نہیں ہوتی جس طرح کی ملکہ کا ذکر ان آیات میں ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی حکومت "ولایت کاملہ" تھی تو اگر اس کی اس کامل حکومت کو دلیل بنایا جا سکتا ہے تو پھر کامل حکومت کی سربراہی بھی عورت کے لئے جائز ہونی چاہیئے حالانکہ حضرت تھانوی اس کے قائل نہیں ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے اپنی سابقہ رائے سے رجوع کر لیا تھا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ علماء ربانیین میں سے تھے اور اخلاص وللہیت کے بلند مقام پر فائز تھے۔ خدا پرست اور حق پرست علماء کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ جب بھی اپنے رائے کی کمزوری محسوس کرتے ہیں فوراً اس سے رجوع کر لیتے ہیں۔ حضرت تھانوی کی امداد الفتاوٰی میں دی گئی رائے کی جن کمزوریوں کا ذکر میں نے اپنے درج بالا تبصرے میں کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان کا بعد میں احساس ہو گیا تھا اور انھوں نے اس رائے سے رجوع فرما کر ہر قسم کی حکومت میں عورت کی فرمانروائی کو ناجائز قرار دے دیا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ:۔

امداد الفتاوٰی کی درج بالا تحقیق ۱۳۳۰ھ کی ہے اور ۱۳۶۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔ عمر کے آخری سال میں حضرت تھانوی کی براہ راست نگرانی میں مفتی محمد شفیعؒ نے احکام القرآن کا وہ حصہ لکھا تھا جو حضرت نے ان کے سپرد کیا تھا۔ زیر بحث مسئلے پہ احکام القرآن کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں لیکن اصل عبارت بھی ملاحظہ کیجئے۔

ان المرأۃ لا تصلح ان تکون ملکۃ فی شریعۃ محمدؐ و ان واقعۃ بلقیس من عمل الکفرۃ فلا یحتج بہ علی ماقالہ الآلوسیؒ ؎

"محمدؐ کی شریعت میں عورت حکمران بننے کی اہل نہیں ہے — اور بلقیس کا واقعہ کفار کا عمل تھا۔ اس لئے یہ حجت نہیں بن سکتا۔ جیسا کہ

؎۔ احکام القرآن از مفتی محمد شفیعؒ طبع کراچی ۱۹۸۷ء ص ۲۹ ج ۲

علامہ آلوسی نے کہا ہے (روح المعانی میں)

اس جگہ جمہوری اور غیر جمہوری کا کوئی فرق نہیں کیا گیا بلکہ مطلق الفاظ میں کہا ہے کہ عورت حکمرانی کی اہلیت نہیں رکھتی۔ امداد الفتاویٰ میں بلقیس کی حکومت کو جمہوری سلطنت میں عورت کی حکمرانی کے جائز ہونے کی دلیل قرار دیا گیا لیکن احکام القرآن کی درج بالا عبارت میں اس دلیل کو یہ کہہ کر خود ہی رد کر دیا ہے کہ یہ کفار کا عمل تھا جو حجت نہیں ہے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنی وفات سے ۳۲ سال پہلے لکھی گئی تحریر سے رجوع کر لیا تھا۔ واللہ اعلم۔ اس کے علاوہ مولانا تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کا اقتباس پہلے نقل ہو چکا ہے۔ جس میں عدم جواز کی وہی دلیل دی گئی ہے جو احکام القرآن کی درج بالا عبارت میں دی گئی ہے اور دوسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ "اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدیؐ اس کے خلاف ہوتے ہوئے حجت نہیں ہے۔ نیز احکام القرآن کے مرتب حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں اجماع نقل کیا ہے کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی۔ احکام القرآن، بیان القرآن، اور معارف القرآن تینوں میں جمہوری اور شخصی یا کامل اور ناقص کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی، بلکہ مطلقاً کہا گیا ہے کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی اور بلقیس کے واقعے سے جو استدلال امداد الفتاویٰ میں کیا گیا تھا۔ اسے خود ہی رد کر دیا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا قرینہ ہے کہ حضرت تھانویؒ نے اپنی سابقہ تحقیق سے رجوع کر لیا تھا اور اپنے سابقہ استدلال اور توجیہہ کی کمزوری ان پر واضح ہو گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ عورت کی حکمرانی کا جواز ڈھونڈنے والے مضمون نگار امداد الفتاوے کی عبارت کا حوالہ تو دیتے ہیں لیکن حضرت تھانوی کی آخری عمر میں قائم کی گئی اس رائے کا حوالہ نہیں دیتے جس کا ذکر احکام القرآن اور بیان القرآن میں ہوا ہے۔

(۵) غیر مسلم خواتین کی حکمرانی کو سندِ جواز بنانا

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ایک پروفیسر صاحب نے پاکستان کے علماء پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس حدیث (لن یفلح قوم الخ) کا جائزہ لینے سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق صرف ایران کی ملکہ پوران دخت پر ہوتا ہے اور اسے بوجوہ قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جاسکتا۔ کیوں کہ درایت مفتیوں کے فتویٰ کی تائید اور تصویب نہیں کرتی" دلیل کے طور پر ملکہ کیتھرائن، ملکہ وکٹوریہ، ملکہ ایلزبتھ، ملکہ این اور اس طرح کی اور متعدد غیر مسلم خواتین کی حکمرانی کی تاریخی مثالیں دی ہیں۔ جنہوں نے حکومت کا نظام چلانے میں کامیابیاں حاصل کی ہیں اور ان کے دور میں بہت سی فتوحات ہوئی تھیں اور معاشی طور پر ترقی ہوئی تھی۔ اگر حضور کا یہ فرمان عام ہوتا تو یہ خواتین کامیاب نہ ہوتیں۔

جواب

(۱) جس درایت کا حوالہ اس تاریخ دان نے دیا ہے۔ اسے اگر پاکستانی مفتی نہیں سمجھ سکے تو کیا اس کو ابو سلیمان خطابیؒ، ابن حجر عسقلانیؒ اور بدرالدین عینیؒ بھی نہیں سمجھ سکے جنہوں نے اپنی زندگیاں حدیث پڑھنے اور پڑھانے میں گزاری تھیں ان شارحینِ حدیث نے تو اسی حدیث کا حوالہ دے کر لکھا ہے :۔

قال الخطابی رح فی الحدیث ان المرأۃ لا تلی الامارۃ ؎

"امام خطابی نے کہا ہے کہ اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی ہے"

؎ فتح الباری از ابن حجر ص ۱۲۷ ج ۹ و عمدۃ القاری از بدرالدین عینی ص ۵۹ ج ۱۸ کتاب المغازی

ان محدثین کو بھی اس حدیث کا شان ورود معلوم تھا لیکن انھوں نے اسے ایک عام کلیہ سمجھ کر جنس عورت کی حکمرانی کو ممنوع کہا ہے۔ اس کے علاوہ میرے اس مقالے میں ابن حزم، ابن عربی، ابن کثیر، قرطبی، ابن الہمام، قاضی ثناءاللہ پانی پتی، شاہ ولی اللہ قاضی شوکانی اور مولانا عبدالرحمان مبارک پوری کے جو اقوال نقل کئے گئے ہیں ان سب میں عورت کی حکمرانی کے عدم جواز پر اور دلائل کے علاوہ اس حدیث کو بھی عام سمجھ کر دلیل قرار دیا گیا ہے۔ کیا یہ سب اس درایت کو نہیں سمجھ سکے تھے جس کو ہمارے یہ پروفیسر سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ نام تو میں نے بطور نمونہ لکھے ہیں ورنہ اس حدیث کو تو ہر دور میں فقہا اور محدثین نے عورت کی حکمرانی کے جائز نہ ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر آج سپریم کورٹ کے چھ سات جج آئین کی کسی دفعہ کی تعبیر کا فیصلہ سناتے ہیں تو اسے حتمی فیصلہ سمجھ کر سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور کوئی تاریخ داں اگر اس تعبیر کو غلط کہہ دے لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔ جج فرشتہ تو نہیں ہوتا ماہر قانون ہی تو ہوتا ہے۔ سینکڑوں ماہرین حدیث اس حدیث کی تعبیر یہ کرتے ہیں کہ اس کا حکم عام ہے مگر پندرہویں صدی کا یہ پروفیسر فرماتا ہے کہ نہیں یہ حکم تو پوران دُخت کے ساتھ مخصوص ہے۔ عام کلیہ نہیں ہے۔ آخر سے کوئی بتائے کہ ہم بتائیں کیا۔

(۲) قاعدہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی نصوص میں الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے۔ شان نزول اور شان ورود کے خصوص کا لحاظ نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کی کئی آیات یہود، نصاریٰ، مشرکین مکہ اور منافقین مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ان آیات کا حکم عام ہے۔ جو بھی ان آیات کا مصداق بن سکتا ہو ان پر یہ آیات منطبق ہوں گی۔

(۳) اگر رسول اللہ کی یہ پیشین گوئی ایرانیوں کے ساتھ مخصوص ہوتی تو الفاظ

یوں ہوتے کہ لن یفلحوا اذ ولّوا امرہم امراۃً۔ یہ ایرانی ہرگز کامیاب نہ ہوں گے جب کہ انہوں نے ایک عورت کو سربراہ بنا دیا ہے۔ لیکن الفاظ یہ نہیں ہیں۔ بلکہ یوں ہیں کہ لن یفلح قومٌ ولّوا امرھم امراۃً "ہرگز کامیاب نہیں ہوگی ہر وہ قوم جس نے کسی بھی عورت کو اپنا حکمران بنا دیا ہو" عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ نکرہ پر جب حرف نفی داخل ہوتا ہے تو اس سے عموم مراد ہوتا ہے۔ اس جگہ "قوم" کا لفظ نکرہ ہے۔ جس پر حرف نفی "لن" داخل ہوا ہے تو اس سے مراد صرف ایرانی قوم یا کوئی دوسری مخصوص قوم نہیں ہو سکتی بلکہ دنیا کی ہر قوم مراد ہے۔ اسی طرح "امراۃ" کا لفظ بھی نکرہ ہے جو عموم کے لیے آتا ہے تو اس سے بھی کوئی معہود و مخصوص عورت مراد نہیں ہے بلکہ دنیا کی ہر عورت مراد ہے۔ حدیث کے الفاظ اگرچہ اخبار کے ہیں انشا کے نہیں ہیں یعنی صرف یہ خبر دی ہے اور پیشنگوئی کی ہے کہ عورت کو سربراہ بنانے والی قوم کامیاب نہیں ہو گی۔ یہ نہیں فرمایا کہ عورت کو حکمران نہ بناؤ۔ مگر قاعدہ یہ ہے کہ شارع کی خبر اس کے حکم کے مترادف ہوتی ہے۔ رسول اللہ جب کسی فتنے کی خبر دیتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس فتنے سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اس قاعدے کی رو سے حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کو حکمران نہ بناؤ کیونکہ عورت کو حکمران بنانے والی قوم فلاح نہیں پائے گی۔

(۴) باقی رہی یہ بات کہ کیتھرائن اور ملکہ وکٹوریہ جیسی کئی خواتین نے حکومتیں کی ہیں۔ اور کامیاب رہی ہیں۔ تو اگر فلاح کے یہی معنیٰ ہیں کہ فتوحات حاصل کر کے نو آبادیاں بنا دی جائیں اور معاشی میدان میں خوش حالی و ترقی آجائے تو پھر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اسلام میں غیر مسلم کی حکومت بھی جائز ہے۔ حالانکہ یہ تو اتفاقی مسئلہ ہے کہ کافر کی حکومت جائز نہیں ہے اور ظالم لوگ حکمرانی کے مستحق نہیں ہیں۔ حقیقت میں کامیابی اور فلاح یہ ہے کہ ایسا پاکیزہ معاشرہ قائم کیا جائے جس میں عدل و انصاف کی

حکومت ہو۔ جن غیر مسلم ملکاؤں اور خاتون حکمرانوں کی کامیابیوں کا حوالہ دیا جا رہا ہے ان کے دور میں انسانیت کی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ صرف مادی وسائل میں ترقی ہوئی تھی اور اسی انسانی اقدار سے عاری مادی ترقی کی وجہ سے دنیا نے دو عالمگیر جنگیں بھی دیکھی ہیں۔ جن میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسان تباہ ہوئے تھے اور آج بھی اسی خدا ناشناس ترقی نے دنیا کی تباہی و بربادی کا سامان ایٹم بم کی شکل میں تیار کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ حقیقی فلاح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مستقبل روشن اور خوشحال ہو جائے۔ حال کی خوش حالی اگر مستقبل کی تباہی و بربادی کا ذریعہ بن جائے تو یہ ناکامی و نامرادی ہے۔ کامیابی نہیں ہے۔ یاد رہے کہ اصل مستقبل موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔

الائمۃ من قریش کا مفہوم

ہمارے اس تاریخ دان نے یہ بھی کہا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ "حکمران قریش میں سے ہوں گے" لیکن اس خبر اور پیشین گوئی کے باوجود ترکوں کی خلافت قائم ہوئی تھی جو قریش نہیں تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں ایک خبر دی گئی ہے کوئی عام کلیہ بیان نہیں ہوا کہ ہمیشہ کے لئے خلافت قریش ہی کا حق ہے اسی طرح لن یفلح قوم ولو امرہم امرأۃ بھی کوئی کلی حکم نہیں ہے۔ بلکہ ایک خبر ہے جو ایران کی ملکہ پوران دخت کے ساتھ مخصوص ہے۔

حدیث کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لئے موضوع سے متعلق دوسری احادیث کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو احادیث و روایات کے دوسرے طُرُق پر وسیع عبور حاصل ہو۔ صرف تاریخ دانی سے یہ کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ قریش کی حکومت کے بارے میں یہ پیشین گوئی مشروط ہے۔ غیر مشروط اور

مطلق نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں ارشادِ رسول نقل ہوا ہے کہ

مَا اَقَامُوا الدِّیْنَ اور مَا حَکَمُوْا فَعَدَلُوْا ۔

یعنی "قریش اسی وقت حکمران رہیں گے جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں گے اور عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کریں گے۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قریش جب اقامت دین اور حکم بالعدل کا فریضہ ادا کرنا ترک کر دیں گے تو پھر حکومت ان کے ہاتھ سے چلی جائے گی۔ جب خود حدیث میں توقیت و تحدید کر دی گئی ہے تو قریش کی حکومت کو کلیۃً اور ابدی حکم کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن عورت کی حکمرانی سے متعلق حدیث میں نہ تو کوئی شرط لگائی گئی ہے اور نہ کوئی تحدید و توقیت ذکر ہوئی ہے۔ اس لئے یہ شریعت کا ابدی حکم ہے۔

(۶) مسلمان شہزادیوں کی حکمرانی کو سندِ جواز بنانا

عورت کی حکمرانی کے جواز اور حدیث رسولؐ کے ایرانی ملک کے ساتھ مختص ہونے پر رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بھوپال کی شہزادیوں کی حکومتوں کو بھی بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک اصولی اور دینی مسئلے میں بادشاہوں اور شہزادیوں کا طرز عمل دلیل کی کون سی قسم ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سرے سے دلیل ہی نہیں ہے۔ اگر بادشاہوں اور شہزادیوں کا طرز عمل دلیل ہے تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موروثی بادشاہت بھی اسلام میں جائز ہے۔ کیوں کہ مسلمان بادشاہتوں کے طرز عمل میں تو یہ بھی شامل ہے۔ بلکہ یہ بھی کہنا پڑے گا کہ حکومت تلوار کے زور پر حاصل کرنا اور شاہی امراء کی سازشوں سے حاصل کرنا بھی اسلام میں جائز ہے۔ مسلمان بادشاہتوں میں تو یہ رواج بھی رہا ہے بادشاہت اور ملوکیت کا نظام کسی شریعت اور قاعدے قانون کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ بادشاہ سلامت کی خواہش ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض مسلمان بادشاہ اور بعض شہزادیاں

انفرادی طور پر اچھے کردار کی حامل بھی ملتی ہیں لیکن ان کا نظام حکومت شرعی اصول کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ حیرت ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے عمل کو تو دلیل بنایا جا رہا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی رضیہ سلطانہ کو جانشین مقرر کیا تھا اور ان درباری امرا اور فوجی افسروں کے عمل کو بھی سند جواز بنایا جا رہا ہے جنہوں نے رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بھوپال کی شہزادیوں کو حکومت کے تخت پر بٹھایا تھا۔ لیکن رسول اللہ، خلفائے راشدینؓ، بنو امیہؒ اور بنو عباسیہ کے حکمرانوں کے طرز عمل کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا جنہوں نے صحابیاتؓ اور شہزادیوں کو نہ جانشین مقرر کیا تھا اور نہ حکمرانی کے تخت پر بٹھایا تھا۔ رسول اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ میری اور میرے صحابہ کی سنت پر قائم رہو۔ لیکن آج کچھ لوگ بے نظیر صاحبہ کے اتنے زیادہ دلدادہ ہو گئے ہیں کہ بادشاہوں اور قیصر و کسریٰ کی سنت پر چلنے اور چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر مسلمان کے طرز عمل ہی کو دلیل بنانا ہے تو ان چند خواتین کو جن کی تعداد تاریخ اسلام کے پورے چودہ صد سالہ دور میں ۲۰ تک نہیں پہنچائی جا سکتی بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے تو مسلمانوں کی ان چودہ صدیوں کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں حکومتوں کو کیوں دلیل نہیں بنایا جاتا جن کے سربراہ مرد تھے، عورتیں نہیں تھیں مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کے تعامل کو چھوڑ کر چند گنی چنی خواتین کو دلیل بنانا تحقیق نہیں ہے بلکہ محض ایک سینہ زوری ہے۔

رضیہ سلطانہ کو بغاوت پر قابو پانے کے لئے فوج کے افسروں اور چند درباری امرا نے ۶۳۴ھ میں تخت پر بٹھایا تھا۔ لیکن علما اور بہت سے امراء نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔ صرف تین سال چھ دن حکومت کرنے کے بعد ۲۵ ربیع الاول ۶۳۷ھ کو قتل کر دی گئی[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۲۶۲ ج ۱

چاند بی بی اپنے شوہر علی عادل شاہ کے قتل کے بعد اس کے نو سالہ بھتیجے کی نگران بنائی گئی اور بعد میں بیجاپور اور احمد نگر کی مشترکہ حکمران بنا دی گئی۔ مگر بالآخر اپنے ہی سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئی۔

بھوپال کی بیگمات کی حکومتوں کا پس منظر یہ ہے کہ نذر محمد خاں نے ۱۸۱۶ء میں انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے انگریزوں نے ذمہ لیا تھا کہ بھوپال کی ریاست اس کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے محفوظ رہے گی اور اس کے صلے میں ریاست کی فوج انگریزوں کی مدد کرے گی۔ اس معاہدے کی رو سے ریاست کی حکمرانی نذر محمد کی اولاد کے علاوہ کسی اور کو نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس لئے ریاست کو انگریزوں کے قبضے سے بچانے کے لئے ۱۸۲۰ء میں نذر محمد کی نابالغ بیٹی سکندر بیگم کو ریاست کی والی بنایا گیا اور قدسیہ بیگم کو نگران کے طور پر منتظمہ مقرر کیا گیا اور پھر ۱۸۴۵ء میں سکندر بیگم باقاعدہ طور پر ریاست کی والی بن گئی اور اس کے بعد بھوپال کی شہزادیوں کا سلسلہ چلا۔

ان بیگمات کی حکومتیں مخصوص حالات میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے قائم ہوئی تھیں لیکن یہ کوئی اتنی بڑی شرعی مجبوریاں بھی نہیں تھیں۔ اصل موروثی بادشاہت کا وہ مزاج تھا جس کو بدلنے کے لئے ان کے اندر اخلاقی جرأت نہیں تھی۔ اگر والیان بھوپال کی یہ سنت درست تھی تو پھر کہنے والا کل کو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ انگریزوں کی مدد کرنا بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ نذر محمد خاں والی بھوپال نے وعدہ کیا تھا کہ میری ریاست کی فوجیں انگریزوں کی مدد کریں گی۔

رضیہ بیگم، چاند بی بی اور بیگمات بھوپال یا دوسری مسلم خواتین کی حکومتوں کے جواز کا فتویٰ علماء نے نہیں دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالات کے دباؤ کی بناء پر کچھ علماء خاموش ہو گئے تھے اور اس فتنے کو ایک امر واقعہ کے طور پر کسی نے بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسی طرح نواب صدیق الحسنؒ نے اگر بھوپال کی شہزادیوں کی

حکومت کی مخالفت نہیں کی تھی تو ان کے سامنے کچھ مصلحتیں ہوں گی۔ ورنہ جواز کا فتویٰ تو انھوں نے بھی نہیں دیا تھا۔

(۷) صدارت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی نامزدگی کو سندِ جواز بنانا

ایوب خانی آمریت سے نجات حاصل کرنے کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی انتخاب میں امیدوار نامزد کیا گیا تھا۔ اس وقت مولانا مودودیؒ جیل میں تھے مفتی محمد شفیعؒ نے رائے دے دی کہ "دو برائیوں میں سے کمتر برائی کو اختیار کر لیا جائے" رہائی کے بعد مولانا مودودیؒ نے بھی اس رائے کی تائید کر دی۔ اس نامزدگی کو بھی آج محترمہ بے نظیر کے حمایتی بڑے زور شور سے پیش کر رہے ہیں۔ اور بے نظیر صاحبہ نے بھی قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس وقت عورت سربراہ بن سکتی تھی تو آج کیوں نہیں بن سکتی۔

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ مفتی محمد شفیع کا فتویٰ ہم نے نقل کر دیا ہے کہ عورت کی حکمرانی کے جائز نہ ہونے پر اجماع ہے اور مولانا مودودیؒ کی کتاب اسلامی ریاست کا اقتباس بھی ہم نے نقل کر دیا گیا ہے۔ جس میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ عورت نہ صرف یہ کہ سربراہ حکومت بننے کی اہل نہیں ہے، بلکہ پارلیمنٹ کی رکنیت اور مختلف محکموں کی سربراہی کے لیے بھی اس کا انتخاب درست نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ کی جانب سے عورت کی حکمرانی کے عدم جواز کے شرعی اصول کی اس غیر مبہم وضاحت کے باوجود جو انھوں نے اپنی کتابوں میں کی ہے۔ ان کو عورت کی سربراہی کی تائید کرنے والوں میں

شمار کرنا دھوکہ دہی اور سیاست بازی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ کمتر برائی کو بڑی برائی سے نجات حاصل کرنے کے لیے وقتی طور پر گوارا تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے جواز کی سند اور مستقل اصول نہیں بنایا جا سکتا۔ بڑی برائی کے مقابلے میں کمتر برائی کو وقتی طور پر گوارا کرنے کی اجازت تو ابوداؤد کی ایک حدیث میں موجود ہے۔ لیکن عورت کی سربراہی کا جواز کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے بلکہ جائز نہ ہونا ثابت ہے۔ اس کے علاوہ محترمہ فاطمہ جناح کو دراصل ایوب خاں کے خلاف تحریک کی قیادت کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ ملک کی مستقل طور پر صدارت کے لیے نامزد نہیں کیا گیا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ منتخب ہو جانے کی صورت میں تین ماہ کے اندر پارلیمانی نظام کے لیے نئے انتخابات کرائے جائیں گے اور نیا مرد صدر منتخب کیا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ بے نظیر کی حکومت کو محترمہ فاطمہ جناح کی نامزدگی پر کس طرح قیاس کیا جاتا ہے۔ آج وہ کون سا ڈکٹیٹر یا آمر ہے جسے گرانے کے لیے بے نظیر کو یہ زحمت دی جا رہی ہے۔ جس کو یہ آمر سمجھتی تھی اسے اللہ نے شہادت کی سعادت مرحمت فرما دی ہے اور اپنے پاس بلا لیا ہے۔ پیپلز پارٹی نے اگر انتخابات جیتے ہیں تو وہ کسی مرد کو بھی وزیر اعظم کی ذمہ داری سونپ سکتی ہے۔ اس عظیم ذمہ داری کیلئے آخر ایک لڑکی کو جس کی گود میں ایک بچہ بھی ہے۔ کیوں تکلیف دی گئی ہے جب کہ اس سے شریعت کا ایک اصول بھی پامال ہوا ہے ہے اور وہ کون سی بڑی برائی ہے جس سے بچنے کے لیے اس اصول کو توڑا گیا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ ملک کی سالمیت کو خطرہ ہے اور سندھ میں علیحدگی پسندوں کی سازشیں ہو رہی ہیں جن کے مقابلے میں بے نظیر کو وزیر اعظم بنایا گیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس خطرے کا مقابلہ عدل و انصاف کے قیام اور شریعت کے نفاذ ہی سے ممکن ہے۔ کیوں کہ ہر قسم کی لسانی، نسلی اور علاقائی عصبیتوں کا استیصال شریعت سے ہی ہو سکتا ہے جو ملک کے تمام مسلمانوں کے درمیان

قدرِ مشترک ہے اور ملک کا بنیادی نظریہ ہے۔ لسانی اور نسلی قومیتوں اور علاقائی تعصبات سے نجات کا ذریعہ بے نظیر نہیں ہیں۔ بلکہ اسلامی قومیت کی فضا پیدا کرنا ہے اور اسلامی نظام کا قیام ہے۔ اگر پیپلز پارٹی کو سندھیوں نے بالاتفاق منتخب کیا ہے تو سندھ کی راہنمائی یہ پارٹی کر سکتی ہے۔ مگر اس کے لیے بے نظیر کی قیادت اور وزارت کوئی لازمی شرط تو نہیں ہے۔ کیا قیادت و وزارت بھٹو صاحب کی جائداد ہے جس پر قبضہ کرنے کا حق اس کی بیٹی ہی کو حاصل ہے۔ پیپلز پارٹی کا کوئی مرد بھی تو اس بوجھ کو اٹھا سکتا ہے۔ پھر شریعت کے حکم کو پامال کر کے اس نرم و نازک صنف کو کیوں زحمت دی گئی ہے اگر یہ کہا جائے کہ یہ جمہوریت کا تقاضیٰ ہے تو جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کی جمہوریت شریعت کی تابع ہوتی ہے۔ اس سے آزاد نہیں ہوتی۔ یہی ہمارے ایمان کا تقاضا بھی ہے۔ ——

اور ہمارے آئین کی دفعہ ۲ الف قرار دادِ مقاصد کا بھی تقاضا ہے —— کیا ایمان کے تقاضوں اور آئین کے تقاضوں کو پس پشت ڈالنے سے ملک کی سالمیت کا تحفظ ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایک نظریاتی ریاست کی سالمیت اس کے بنیادی نظریئے کی سالمیت پر موقوف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ عمارت کی بنیادیں جب کھوکھلی ہو جائیں تو وہ گر جاتی ہے۔

(۸) سانحۂ جمل میں حضرت عائشہ کی شرکت کو سندِ جواز بنانا

حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینے کی نیت سے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے مکہ جا کر مسلمانوں کو جمع کیا اور ام المومنین حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ آپؓ مسلمانوں کی ماں ہیں۔ اس لیے ہمارے ساتھ بصرہ جائیں تاکہ آپ کے احترام کی وجہ سے وہاں کے مسلمان اس نیک کام میں ہماری مدد کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ چنانچہ آپ نے یہ درخواست قبول کر لی اور بصرہ جانے پر آمادہ ہو گئیں۔ آپ کو ایک اونٹ (جمل) پر سوار کیا گیا تھا۔ اس لیے اس سانحہ کو جنگ جمل کا نام دیا گیا ہے۔ ام المومنین کی اس شرکت

کو کچھ لوگ عورت کی حکمرانی کے لئے سندِ جواز بناتے ہیں۔

جواب

(۱) سانحہ جنگِ جمل میں حضرت عائشہ کی شرکت نہ حکومت کی سربراہی تھی اور نہ حکومت کے حصول کی کوشش تھی، بلکہ عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی ایک کوشش تھی۔ معلوم نہیں کہ اس واقعے کو عورت کی حکمرانی کے جواز کی دلیل کس بناء پر بنایا جارہا ہے۔ آخر یہ بات کس نے کہی ہے کہ عورتیں مظلوم کی حمایت اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی کسی مہم میں بھی شرکت نہیں کرسکتی یہ ایک خلط مبحث ہے اور مغالطہ انگیزی ہے جسے کچھ لوگ دلیل کا نام دے رہے ہیں۔ حدیث اور تاریخ کی کسی کتاب اور کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ مسلمانوں نے حضرت عائشہؓ کو حضرت علی کے مقابلے میں خلافت کے لئے نامزد کیا تھا اور مقصد حضرت علیؓ کو معزول کر کے حضرت عائشہ کو خلافت کے منصب پر بٹھانا تھا۔ بلکہ روایات میں صرف یہ آیا ہے کہ مقصد حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینا اور حالات کو درست کرنا تھا۔ خلیفہ تو سب نے بمعہ حضرت عائشہؓ کے حضرت علی کو تسلیم کرلیا تھا۔ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ حج کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لائی ہوئی تھیں۔ واپس مدینہ منورہ جاتے ہوئے جب "سرف" کے مقام پر پہنچیں تو عبید ابن ابی سلمہ نے اسے یہ ہولناک اطلاع دی کہ حضرت عثمانؓ شہید کردیئے گئے ہیں۔ اور آٹھ دن خلیفہ کے بغیر گزارنے کے بعد مسلمان حضرت علی کی خلافت پر متفق ہوگئے ہیں۔ اس پر ام المومنین نے فرمایا رُدُّونی، رُدُّونی فانصرفت اِلیٰ مکۃ وھی تقول قتل واللہ عثمان مظلوماً۔ واللہ لاُطلبن بدمہ۔ مجھے واپس لوٹا دو۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کو واپس آئیں اور کہنے لگیں خدا کی قسم حضرت عثمانؓ ظلماً قتل ہوئے ہیں۔ میں اس کے خون کا بدلہ لینے کا

مطالبہ کروں گی۔[1]

مکہ مکرمہ سے بصرہ کے لیے روانگی کے وقت جو اعلان ہوا تھا۔ وہ یہ تھا۔

ان ام المومنینؓ وطلحہؓ والزبیرؓ شاخصون الی البصرۃ، فمن اراد اعزاز

الاسلام وقتال المحلین والطلب بثار عثمان ولیس لہ مرکب وجھاز فلیات ۔

"ام المومنینؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ بصرہ جانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ جو لوگ اسلام کا غلبہ، حرم مدینہ کی بے حرمتی کرنے والوں سے لڑنا اور عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ آجائیں۔"

اس اعلان میں نہ حضرت علیؓ کی خلافت کے خلاف کوئی بات کی گئی ہے اور نہ حضرت عائشہؓ کی خلافت قائم کرنے کا کوئی ذکر موجود ہے۔ صرف خون عثمان کا بدلہ لینے کا ذکر ہے۔ ام المومنین جب بصرہ کے قریب پہنچیں تو بصرہ کے سربرآوردہ لوگوں کے نام خط ارسال کیا۔ اور جواب کے انتظار میں ٹھہر گئیں۔ خط ملنے پر بصرہ کے حاکم عثمان بن حنیف نے عمران بن حصین اور ابوالاسود دئلی کو ام المومنین کی تشریف آوری کا مقصد معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ ان دونوں کے سامنے حضرت عائشہؓ نے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"غوغا آرائی اور شورش برپا کرنے والوں نے حرم مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کے امام کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا ہے۔ انہوں نے حرام طریقے پر مال لوٹ لیا ہے۔ حرام طریقے پر خون بہایا ہے اور حرم مدینہ اور شہر حرام کی بے حرمتی کی ہے۔ فخرجت فی المسلمین اعلمھم ما اتی ھؤلاء، وما الناس فیہ وراءنا وما ینبغی لھم من اصلاح ھذہ القصۃ وقرات لاخیر فی کثیر من نجواھم الا من امر بصدقۃ او اصلاح بین الناس۔

"اس وجہ سے میں مسلمانوں کے ساتھ نکلی ہوں تاکہ ان کو باغیوں کے اس

---

[1] الکامل لابن الاثیر ص ۲۰۶ ج ۳

ظلم سے باخبر کر دوں جو انھوں نے کیا ہے اور پریشانی کی اس حالت سے بھی جس میں لوگ ہمارے پیچھے گرفتار ہیں اور مسلمانوں کو وہ تدبیر بھی بتا دوں جو ان کے لئے مناسب ہے۔ اور وہ ہے اصلاح کرانا۔ پھر آپؓ نے یہ آیت پڑھی کہ بہت سے مشوروں میں کچھ بھی بھلائی نہیں ہوتی۔ مگر جو خیرات دینے کا حکم دے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرائے[۱]

بصرہ پہنچنے کے بعد لوگوں کے سامنے دوبارہ بھی تقریر کی اور فرمایا۔

الا ان مما ینبغی ولا یبغی لکم غیرہ اخذ قتلة عثمان واقامة کتاب اللہ وقرأت الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یدعون الی کتاب اللہ لیحکم بینھم ثم یتولی فریق منھم وھم معرضون ال عمران ۲۳[۲]

"لوگو! اچھی طرح سمجھ لو! کہ تمہارے لئے اس سے زیادہ مناسب بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ عثمانؓ کے قاتلوں کو پکڑ لو اور ان پر اللہ کی کتاب کا فیصلہ نافذ کر دو (قصاص) اور یہ آیت پڑھی کہ "کیا نہیں دیکھا تو نے ان کو جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا۔ جب ان کو اللہ کی کتاب کی جانب بلایا جاتا ہے تاکہ یہ کتاب ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو پھر بھی ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں۔"

عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کا اصل مقصد یہ تھا کہ بصرہ کے مسلمانوں کی مدد حاصل کر کے مدینہ منورہ سے باغیوں کا صفایا کیا جائے اور مسلمانوں کے درمیان اگر کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں تو ان کا ازالہ کر کے حالات کو درست کر دیا جائے۔ لیکن اُدھر حضرت

---

[۱] الکامل ص ۲۱۰-۲۱۱ ج ۳

[۲] الکامل ج ۳ ص ۲۱۳۔

علیؓ کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ طلحہؓ اور زبیرؓ ام المومنین کو لے کر بصرہ اس لیئے گئے ہیں کہ یہ میری خلافت کو نہیں مانتے اور قانونی طور پر قائم شدہ خلافت کا استحکام اب میرے فرائض میں شامل ہے۔ نیز حضرت علیؓ کو یہ شبہ بھی تھا کہ شاید عائشہ اور ان کے ساتھیوں کو میرے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اس لیے جا کر اس غلط فہمی کو دور کیا جائے اور اصلاح کی کوئی صورت نکالی جائے۔ جب حضرت علی بصرہ جا رہے تھے تو رفاعہ بن رافع کے بیٹے نے ان سے پوچھا۔ امیر المومنین! آپ کا ارادہ کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ اَمّا الذی نُرِیدُ وَ نَنْوِیْ فالاصلاح اِن قبلوا منا وَاَجابونا۔" ہمارا ارادہ تو اصلاح کا ہے۔ اگر انھوں نے قبول کر لیا اور صلح کی بات مان لی"

بصرہ کے قریب پہنچنے کے بعد حضرت علیؓ نے قعقاع بن عمرو کو اپنا ایلچی بنا کر بصرہ بھیجا تاکہ ام المومنین کو مصالحت پر آمادہ کرے اور ان کے شبہات کا ازالہ کرے۔ قعقاع نے جا کر ام المومنین سے پوچھا۔ اے میری ماں! آپ یہاں کیوں تشریف لائی ہیں۔ انھوں نے فرمایا۔ اے بُنیّ الاصلاح بَیْنَ الناس۔ اے میرے بیٹے لوگوں کے درمیان اصلاح کے لئے آئی ہوں۔ اس کے بعد یہ طلحہؓ اور زبیرؓ سے ملے۔ انھوں نے بھی صلح کی بات کی۔ چنانچہ صلح کے مذاکرات شروع ہو گئے اور آخر کار مکمل بھی ہو گئے اور فریقین نے اطمینان کا سانس لیا۔ دونوں کے لئے یہ خوشی اور مسرت کی رات تھی کہ صبح کو صلح ہو جائے گی، لیکن دونوں جانب قاتلین عثمانؓ اور شورش پسندوں کے ایجنٹ پھیلے ہوئے تھے۔ انھوں نے باہمی مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ اسی رات جنگ شروع کر دی جائے ورنہ اگر صبح کو صلح ہو گئی تو ہماری خیر نہیں ہے۔ ام المومنینؓ نے اور حضرت علیؓ اور فریقین خوشی کی اس رات کو آرام فرما رہے تھے کہ شورش پسندوں نے ایک دوسرے پر حملہ کر کے جنگ شروع کر دی اور پھر وہی ہوا جو مقدر تھا[1]

---

[1] الکامل ج ۳ ص ۲۴۲ اور ۲۳۰ تا ۲۴۲ ملخصاً

اس سانحے کا جو خلاصہ پیش کیا گیا ہے اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ تنازعہ خلافت میں نہیں تھا اور یہ حضرت عائشہ کو سربراہ ریاست بنانے کی مہم نہیں تھی بلکہ اصلاح کی ایک تحریک تھی۔ حضرت علیؓ اور ام المومنین دونوں کے اقوال نقل کر دیئے گئے ہیں۔ جن میں بار بار اصلاح کی بات کی گئی ہے۔ حضرت علیؓ کی خلافت سرے سے زیر بحث ہی نہیں رہی۔ دونوں جانب کے اصحاب رسول مخلصین اور مصلحین تھے۔ دونوں کی نیت اچھی تھی۔ اس لئے دونوں سے محبت و عقیدت رکھنا جزو ایمان ہے اور دونوں سے اللہ راضی ہے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ جو کچھ ہوا فریقین کے درمیان غلط فہمیوں کی وجہ سے ہوا اور یہ غلط فہمیاں بھی دور ہو گئیں تھیں۔ مگر قاتلین عثمان کے ایجنٹوں اور غوغا آرائی کرنے والوں نے خفیہ طور پر جنگ کی آگ بھڑکا کر ام المومنینؓ اور امیر المومنین کے درمیان دوبارہ غلط فہمی پیدا کر دی جس کے نتیجے میں جنگ جمل کا یہ سانحہ فاجعہ رونما ہوا۔

حضرت عائشہؓ اپنے اس اقدام پر پشیمان اور پریشان تھیں

اگرچہ ام المومنینؓ نے اخلاص نیت کے ساتھ یہ اقدام کیا تھا اور اس میں جاہ طلبی یا حکومت کی خواہش بالکل نہیں تھی مگر باوجود اس کے وہ اپنے اس فعل پر پشیمان بھی تھیں۔ اور پریشان بھی تھیں۔ چند حوالے ملاحظہ کیجئے!

ابن سعدؒ متوفی ۲۳۰ھ نے سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ

اذا قرأت هذه الآية وقرن في بيوتكن بكت حتى تبل خمارها[1]

"حضرت عائشہؓ جب یہ آیت پڑھتیں کہ اور گھروں میں وقار کے ساتھ

---

[1] طبقات ابن سعد طبع بیروت ۱۹۵۸ ص ۸۱ ج ۸

ٹھہری رہو تو روتی تھیں۔ یہاں تک کہ اپنے دوپٹے کو آنسوؤں سے تر کر دیتی تھیں۔"

(۲) ابن ابی شیبہؒ متوفی ۲۳۵ھ نے ام المومنین کا قول نقل کیا ہے۔

وددت انی کنت ثکلت عشرۃ مثل الحارث بن ھشام وانی لم اسر مسیری مع ابن الزبیرؓ ¹

"میری یہ آرزو ہے کہ کاش میرے دس بیٹے مرجاتے حارث بن ہشام کی طرح مگر میں ابن زبیرؓ کے ہمراہ یہ سفر نہ کرتی۔" (بصرے کا سفر)

(۳) ابن ابی شیبہؒ نے ام المومنینؓ کا یہ قول بھی نقل فرمایا ہے کہ:۔

وددت انی کنت غصنا رطباً ولم اسر مسیری ھذا ²

"مجھے یہ پسند ہے کہ میں درخت کی ایک تازہ ٹہنی ہوتی مگر یہ سفر نہ کرتی۔"

(۴) ابن سعدؒ ۲۳۰ھ اور ابن ابی شیبہؒ ۲۳۵ھ دونوں نے نقل کیا ہے کہ:۔

قالت عائشۃ لما حضرتھا الوفاۃ ادفنونی مع ازواج النبیؐ فانی کنت احدثت بعدہ حدثا ³

"مجھے نبی کریمؐ کی دوسری ازواج کے ساتھ ہی دفن کردو (امتیازی حیثیت نہ دو) کیونکہ میں نے آپؐ کے بعد ایک نیا کام ایجاد کرلیا تھا۔" (بصرے کا سفر)

ام المومنینؓ کے اس اقدام سے دوسرے جن صحابہؓ اور صحابیاتؓ نے اختلاف رائے

---

¹ المصنف از ابن ابی شیبہ ص ۲۷۷ ج ۱۵ و مستدرک حاکم کتاب معرفۃ الصحابہ ص ۱۱۹ ج ۳

² المصنف کتاب الجمل ص ۲۷۷ ج ۱۵

³ طبقات ابن سعد ص ۷۴ ج ۸ و مصنف ص ۲۷۶ ج ۱۵

کیا تھا اور اسے مناسب قرار نہیں دیا تھا۔ ان کا ذکر اس لئے ضروری نہیں ہے کہ خود انھوں نے بعد میں اپنے اس عمل کو غلط سمجھ لیا تھا اور اس کو یاد کر کے پریشان ہو جاتی تھیں اور اس پر ندامت و پشیمانی کا اظہار کرتی تھیں۔

بہر حال اگر نادم نہ بھی ہوتیں اور دوسرے اصحاب کا ان سے اختلاف رائے نہ بھی ہوتا۔ پھر بھی یہ عورت کی حکمرانی کی دلیل نہیں ہے۔ کیوں کہ عائشہؓ کو حکمران بنایا گیا تھا اور نہ یہ اقدام حکومت کے حصول کے لئے تھا بلکہ خون عثمان کا بدلہ لینے اور اصلاح بین الناس کی خاطر یہ مہم شروع کی گئی تھی۔ اور اس پر بھی وہ بعد میں نادم تھیں۔

(۹) جہاد میں صحابیاتؓ کی شرکت کو سندِ جواز بنانا

"دورِ نبویؐ میں (بعض اوقات) صحابیاتؓ غزوات میں شریک ہوتی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ شہیدوں کی لاشیں اٹھاتی تھیں اور مجاہدین کو پانی پلایا کرتی تھیں"۔[1]

جہاد میں شرکت کو بھی بعض لوگ عورت کی حکمرانی کی دلیل سمجھ بیٹھے ہیں۔ ناطقہ سر بگریباں ہے کہ آخر اس استدلال کو کون سا نام دیا جائے۔ ایک موٹی سی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ حالتِ جنگ (ایمر جنسی) میں جنگی خدمات اور چیز ہے اور پورے ملک کی سربراہی ایک دوسری ذمہ داری ہے۔ جنگی خدمات کو لوقت اور بقدرِ ضرورت حدیث میں جائز قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اگر دشمن کا دباؤ شدید ہو اور اگر امیر المومنین کی جانب سے ہر قابل جنگ شخص کو محاذ پر جانے کا عام حکم صادر ہو گیا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۴۰۳ ج ۱

ہو (نفیرِ عام) تو ایسی ہنگامی حالت میں عورتوں پر لڑنا بھی فرض ہو جاتا ہے اور اس کے لئے شوہر کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ مگر جہاد و قتال کی اصل ذمہ داری مردوں پر ڈالی گئی ہے۔ لیکن ریاست اور حکومت کی سربراہی کی ذمہ داری سے جب قرآن و سنت نے عورت کو سبکدوش کر دیا ہے تو اس کو غزوات میں شرکت یا دوسری مناسب قسم کی سوشل سرگرمیوں پر قیاس کر کے کس طرح جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ صحیح طرزِ فکر یہ ہے کہ قرآن و سنت نے جس چیز کو جائز کہا ہے۔ اسے جائز تسلیم کیا جائے اور جس چیز کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اسے ناجائز تسلیم کیا جائے۔

(۱۰) اسمبلیوں کی رکنیت کو سندِ جواز بنانا

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب خواتین اسمبلیوں کی ارکان بن سکتی ہیں تو حکومت کی سربراہ بھی بن سکتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ سربراہ ارکان اسمبلی ہی میں سے کسی کو بنایا جاتا ہے تو جو اسمبلی کی رکنیت کا اہل ہو اسے حکومت کی سربراہی کا اہل بھی ہونا چاہیئے۔

جواب

اسمبلیاں (مجالسِ شوریٰ) قانون ساز ادارے بھی ہیں اور انتخابی ادارے بھی ہیں اس لئے کہ یہ وزیر اعظم، صدرِ مملکت یا گورنروں اور وزراء اعلیٰ کا انتخاب کرتی ہیں۔ قانون سازی ایک علمی کام ہے اور انتخاب کا تعلق بھی رائے دہی سے ہے۔ عورتیں علمی تحقیق اور رائے دہی سے شرعاً محروم نہیں کی گئیں۔ جس طرح مرد اپنی علمی صلاحیت کے مطابق قانون سازی اور پالیسی سازی کی بحث میں لے سکتا ہے اسی طرح عورت بھی بشرطِ صلاحیت اس بحث میں حصہ لے سکتی ہے۔ وزیر اعظم، صدرِ مملکت، گورنروں اور وزراء اعلیٰ کے مناصب کے لئے انتخاب بھی ظاہر ہے کہ رائے دہی اور غور و فکر سے تعلق رکھتا ہے اور

رائے قائم کرنا اور غور و فکر کرنا ہر ذی عقل اور ذی رائے کا حق ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا فرض بھی ہے خواہ وہ ناقص العقل ہو یا کامل العقل ہو۔ البتہ صرف عورتوں ہی کی رائے سے مذکورہ مناصب کے لیے یا قومی اسمبلی نمائندوں کے لئے انتخاب کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ عورتیں ناقص العقل ہیں مگر عملاً تو ایسا نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ عورتوں کے ناقص العقل ہونے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اس کی رائے اور اس کی علمی تحقیق ہمیشہ غلط ہوتی ہے۔

بعض خواتین بعض مردوں سے دانائی اور ذہانت میں فائق بھی ہو سکتی ہیں۔ قرآن کریم اور صحیح احادیث سے عورتوں سے مشورہ لینا اور اگر صحیح ہو تو اس پر عمل کرنے کا جواز ثابت ہے۔ عورتوں کی نمائندگی کے اس موضوع پر میری کتاب اسلامی سیاست میں تفصیلی بحث موجود ہے۔ اگرچہ مولانا مودودیؒ اسے جائز نہیں سمجھتے تھے مگر مجھے اس کے عدم جواز پر کوئی اصول یا دلیل نہیں مل سکی۔ موجودہ اسمبلیوں کے تو مرد ارکان بھی بالعموم اہلیت کے شرعی معیار پر پورے نہیں اترتے اور خواتین کی حالت تو اور بھی بگڑی ہوئی ہے۔ ان اسمبلیوں کا پورا نظام مغربی جمہوریت اور پارلیمانی سسٹم پر مبنی ہے جو بجائے خود غلط ہے۔ لیکن میں اصولی مسئلہ بیان کر رہا ہوں کہ اگر قومی یا صوبائی نمائندگی اور قانون ساز ادارے کی رکنیت کا شرعی معیار اہلیت موجود ہو تو صرف عورت ہونے کی وجہ سے اسے ان اداروں کی رکنیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا

مگر حکومت کی سربراہی کو قانون ساز اداروں یا انتخابی اداروں کی رکنیت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ عورت کی حکمرانی کے ممنوع ہونے کے لئے قرآن و سنت میں دلائل موجود ہیں۔ مگر ان اداروں کی رکنیت کے ممنوع ہونے کی کوئی شرعی دلیل میرے علم میں نہیں ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سربراہ حکومت کی ذمہ داریاں وسیع ہیں اور وہ پورے ملک کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا ہے، صرف

رائے دینے والا یا بحث میں حصہ لینے والا نہیں ہوتا اور اسمبلیوں کے ارکان کی ذمہ داریاں محدود ہوتی ہیں۔ اس واضح فرق کے ہوتے ہوئے آخر کس طرح پورے ملک کی حکمرانی کو اسمبلیوں کی رکنیت پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

گوہر الرحمان مہتمم شیخ الحدیث دار العلوم تفہیم القرآن

مردان

فروری ۱۹۸۹ء